إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ

علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی

اللطیف

دار العلوم لطیفیہ
مکان حضرت قطب ویلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللطیف ویلور

۳۴ واں شمارہ

بیادگار

شیخ المشائخ اعلحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری

رحمۃ اللہ علیہ (سجادہ نشین خانقاہ حضرت قطب ویلور)

و

مولانا مولوی ابوصالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری المعروف میراں پاشا

رحمۃ اللہ علیہ

مدیر موسس

حضرت اقدس مولانا ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اجراء

بروز چہارشنبہ ۔ ۱۱ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق 3 جنوری سنہ 1996ء

زیر نگرانی :

○ مولانا مولوی ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ قادری ایم۔اے؛
بی کام؛ (عثمانیہ) ادیب فاضل (مدراس) ناظم دار العلوم لطیفیہ ۔ ویلور

○ مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری ادیب فاضل نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ ویلور

زیر ادارت :

○ مولانا مولوی پی۔ محمد ابوبکر صاحب ملیباری لطیفی قادری مدرس دار العلوم لطیفیہ ویلور

○ مولانا مولوی حافظ ابو النعمان شبیر الحق قریشی قادری مدرس دار العلوم لطیفیہ ویلور

نمائندگانِ طلباء :

۱	ایم۔ پی۔ شیخ فضل اللہ	جنجی	تمل ناڈو
۲	سید شاہ جمال اللہ	کڈپہ	آندھرا پردیش
۳	محمد صابر احمد	بلگام	کرناٹک
۴	سید اشرف علی	ملیاگل	کرناٹک
۵	پی۔ پی۔ علی		کیرلہ
۶	محبوب بادشاہ	(شعبۂ حفظ) ملباگل	کرناٹک
۷	شیخ محمد	(شعبۂ حفظ)	تمل ناڈو

فہرست مضامین اللطیف

سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق سنہ 1996ء

غزل قربی علیہ رحمۃ اللہ

قدوۃ السالکین عمدۃ الکاملین سراج العارفین حضرت
مولانا رکن الدین محمد سید شاہ ابوالحسن قربیؔ قادری علیہ الرحمۃ

دلبر اگر مہر سوں لطف کرے تو بھلا
بیدل اگر صدق سوں نہیں مرے تو بھلا

وصل دلارام کی صبح دم رکنے کے تئیں
ہجر کی تاریک شب بیگٹ سرے تو بھلا

چشموں کے دو آہواں حسن کے بستاں میں
سنبل تر یا سمن نہ سوں چیرے تو بھلا

عشق کی شوقی کتیں شوق کی لذّت ستی
ابر نمن چشم سوں آب جھرے تو بھلا

عاشقِ صادق اگر ذات کر اپنی فنا
ذات میں اللہ کے خوں کو ہرے تو بھلا

لجۂ وحدت کتیں نیں ہے کنارا کہیں
عاشقِ صادق اگر اس میں گرے تو بھلا

قربیؔ بیچارہ گر چھوڑ خودی کوں تمام
اپنے خدا کی طرف دل سے پھرے تو بھلا

۱؎ بیگی بمعنی جلدی

پیشکش

مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری عرف ہلال پاشاہ صاحب
نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

رباعیاتِ امجدؔ

سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی

ہاں نقش بر آب ہے ہماری ہستی
جھونکوں سے نفس کے ہے بہارِ ہستی
لو سانس ذرا سوچ سمجھ کر امجدؔ
اُڑتا ہے تنفس سے غبارِ ہستی

دم بند کیا قیدِ نفس میں رکھ کر
بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں رکھ کر
صیاد کی صید پروری تو دیکھو
گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر

لبریز مئے عشق سے ہے جام امجدؔ
مئے خواروں میں ہے بلند مقام امجدؔ
مسجد میں تو پوچھتا نہیں کوئی ہے
مئے خانے میں دیکھئے مقام امجدؔ

سرکار پہ جبر کون کر سکتا ہے
مختار پہ جبر کون کر سکتا ہے
بخشے تو کرم ہے ورنہ اس کی مرضی
جبار پہ جبر کون کر سکتا ہے

ادارہ

افتتاحیہ

نبیٔ آخرالزماں خاتم الانبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت عالم گیر حیثیت اور آفاقی نوعیت کی حامل ہے۔ اور آپؐ ساری دنیا کی قوموں، قبیلوں اور نسلوں کی جانب تا قیامِ قیامت نبی بناکر بھیجے گئے ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے: وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً: ہم نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اور آپؐ کی ذات ستودہ صفات پر نبوّت کے سلسلہ کی تکمیل کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شیئٍ علیما: محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ اور زبانِ نبوت نے بھی اس عظیم حقیقت سے آگاہ کیا:

الا لانبی بعدی: آگاہ رہو میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

لہٰذا اب قیامت تک آنے والے انسان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے اور جو لوگ نبوتِ محمدیؐ پر ایمان لائیں گے اور دنیا میں اچھے عمل کریں گے اُن کے لیے اخروی زندگی میں نعمتوں اور راحتوں کی بشارت ہے اور یہ خوش نصیب افراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امّتِ اجابت میں شامل ہوں گے اور جو لوگ نبوتِ محمدیؐ پر ایمان نہیں لائیں گے ان کے لیے اخروی زندگی میں عذابوں کی خبر ہے۔ اور یہ بدنصیب افراد امتِ دعوت میں شامل ہوں گے۔ امتِ دعوت ہی کو دوسرے الفاظ میں غیر مسلموں سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کے متعلق قرآن وحدیث اور مذاہبِ اربعہ میں کافی تصریحات اور تفصیلات موجود ہیں۔ جن کے مطالعہ سے غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے ساتھ روابط و تعلقات اور معاملات کو سمجھنے میں اچھی خاصی روشنی ملتی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق دو طرح کا ہے ایک تعلق قانونی ہے جس میں دستوری

حیثیت سے ان کے حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور ان کی ادائیگی اسلامی مملکت پر فرض ہے۔ دوسرا تعلق عوامی ہے۔ جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان رہن سہن، ربط وضبط اور لین دین وغیرہ شامل ہے۔

فقہائے کرام نے غیر مسلموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:۔

پہلی قسم: (ذمّی) وہ غیر مسلم ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی اور مسلمانوں نے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور یہ مغلوب ہونے کے بعد اسلامی مملکت میں وفادار شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر رضامند ہو گئے۔

یا مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کی بلکہ صلح اور معاہدہ کے ذریعہ وفادار شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر رضامند ہو گئے اور اسلامی مملکت کا جزء بن گئے۔ جیسا کہ عہدِ نبوت میں نجران کے باشندوں نے کیا۔

اس قسم کے غیر مسلم باشندوں کو ذمّی کہا جاتا ہے اور ان سے ان کی مالی قوت وطاقت کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک نہایت معمولی سی رقم وصول کی جاتی ہے جس کو جزیہ کہا جاتا ہے اور یہ غیر مسلم باشندے شہری حقوق میں مسلمانوں کے مساوی سمجھے جاتے ہیں۔

اور اسلامی مملکت ان کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہے اور انھیں اپنے مذہبی امور و رسومات میں پوری آزادی دی جاتی ہے۔

دوسری قسم: [مستامن] وہ غیر مسلم جو کسی دوسرے ملک کے باشندے ہیں اور تجارتی ضرورت یا کسی دوسری غرض سے اسلامی مملکت میں اقامت پذیر ہیں۔ ان سے تجارتی عشر (دسواں حصّہ) کے علاوہ کوئی ذاتی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ ذمیوں اور مسلمانوں کی طرح ان کے جان ومال اور عزّت وآبرو کی حفاظت کرنا اسلامی مملکت کا فرض ہوتا ہے۔ اور ان کو مستامن کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم: [معاھد] وہ غیر مسلم ہیں جو اپنے ملک میں رہتے ہوئے اسلامی مملکت سے ناجنگ معاہدہ کرلیں۔ ان کے لیے اور اسلامی مملکت کے لیے فرض ہے کہ معاہدہ کی شرائط کی پابندی کریں۔

چوتھی قسم: [حربی] وہ غیر مسلم باشندے جن کے ساتھ مذکورہ اقسام معاہدات میں سے کسی قسم کا معاہدہ نہ ہو لیکن ان کے ساتھ بھی انسانی حقوق کی رعایت کا حکم موجود ہے۔ ان کو حربی کہا جاتا ہے۔

غیر مسلم خواہ ذمی ہوں یا مستامن، معاہد ہوں یا حربی ان سب کے بارے میں قرآن کریم کی

پہلی ہدایت یہ ہے : قولوا للناس حسنا : لوگوں کے ساتھ اچھی بات کریں اور عدل وانصاف سے کام لیں حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی ظلم وتعدی کا معاملہ نہ ہو۔

ولا یجرمنکم شنان قوم علی الّا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی : کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ بہر حال عدل وانصاف کرو۔ یہی بات تقوی (اسلام) کے قریب ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: الخلق عیال اللہ واحب الی اللہ تعالے من احسن الی عیالہ : سارے انسان خدا کا کنبہ ہے اور وہ شخص خدا کے قریب سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ (انسان) کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لایرحم ولایرحم : جو شخص انسانوں کے ساتھ محبت والفت اور شفقت سے نہیں پیش آتا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم نہیں کرتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: الدین النصیحۃ : دین نصیحت ہے۔ نصیحت کی شرح مختلف زاویوں سے کی گئی ہے۔ اس میں سے ایک تشریح یہ بھی ہے کہ انسانوں کے ساتھ خیر وبھلائی سے پیش آئیں۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا: احب للناس ما تحب لنفسک : آدمی اپنے لیے جو بات پسند کرتا ہے وہی دوسرے انسانوں کے لیے پسند کرے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: لا یومن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحب الا للہ عزوجل : مسلمان اسی وقت کامل مومن ہوگا جب کہ وہ اور لوگوں کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور صرف اللہ کی خوشنودی کے خاطر کسی آدمی سے محبت کرے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ حسن سلوک، دوستی اور تعاون کے پیچھے کوئی ذاتی منفعت اور غرض وغایت شامل نہ رہے۔ بلکہ الحب للہ کی شان قائم رہے۔

کسی انسانی گروہ کا دوسرے گروہ کے ساتھ ان حالات میں کریمانہ سلوک اور رحیمانہ برتاؤ سے پیش آنے کی بات انتہائی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے نازک مرحلہ میں بھی مسلمانوں کو جذبات پر قابو رکھنے اور عدل وانصاف سے کام لینے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے : ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین : حد سے تجاوز نہ کرو

اللہ تعالیٰ حد سے متجاوز ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی حالات اور معرکہ آرائی کے وقت بھی انسانیت و شرافت اور رحمت و رافت کا دامن تھامے رہنے کی ہدایت دی۔

لاتقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا ولا صغیرا ولا امراۃ ولا تمثلوا

بوڑھے آدمیوں، چھوٹے اور معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو اور کسی مقتول کی شکل نہ بگاڑو

اسلام کی تاریخ میں غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والی سب سے پہلی لڑائی غزوۂ بدر ہے اور یہ جنگ بھی مدافعانہ تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین ایک عرصۂ دراز تک غیر مسلموں کے ظلم و ستم صبر و ضبط کے ساتھ سہتے اور برداشت کرتے رہے۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اپنے وطنِ مالوف مکۂ مکرمہ ہی کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر یثرب (مدینۂ منوّرہ) میں بود و باش اختیار کر لی۔ لیکن غیر مسلموں نے یہاں بھی انھیں چین و سکون کے ساتھ رہنے نہیں دیا۔ اور مدینۂ منوّرہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکرِ جرار لیے ہوئے نکل پڑے اس قسم کے جارحانہ اور ظالمانہ اقدام کے وقت دنیا کی کوئی قوم بھی مدافعت کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چناں چہ مسلمانوں نے بھی اپنی عزت و آبرو، جان و مال اور دین و مذہب کی حفاظت کے خاطر حملہ آوروں سے مقابلہ کیا اور فتح و نصرت اور غلبہ سے ہمکنار ہوئے اور غیر مسلموں کے ستّر افراد قید کر لیے گئے۔ اس عہد کا مزاج یہ تھا جب ایک قوم دوسری قوم پر جنگ میں غالب آجاتی تو فاتح قوم مفتوح قوم کے افراد پر اپنا جنگی رعب قائم رکھنے کے لیے قیدیوں کو قتل کر دیتی تھی۔ اور قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک اور بہیمانہ رویہ قائم رکھتی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے گرفتار شدہ انسانوں کے ساتھ جو سلوک اور رویہ اختیار کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

غزوۂ بدر کے موقع پر کچھ قیدیوں کو رسی سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ رات کے سناٹے میں قیدیوں کے کراہنے کی درد بھری آواز سنائی دی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کی جانب چل پڑے اور ان کے احوال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کچھ قیدیوں کی رسیاں مضبوطی سے باندھی گئی تھیں آپؐ نے رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ اور صبح ہونے کے بعد قیدیوں کو حضرات صحابہؓ کے حوالہ فرمایا اور فرمایا کہ ان کے کھانے پینے کا بہتر انتظام کریں۔ اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا بیان ہے کہ:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوتی بالاسیر فیدفعہ الی بعض المسلمین فیقول احسن الیہ فیکون عندہ الیومین والثلاثۃ فیوثرہ علی نفسہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قیدی لایا جاتا تو آپ کسی مسلمان کے حوالہ کر دیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ یہ قیدی اس کے پاس دو تین دن رہتا اور وہ مسلمان قیدی کی

کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا۔

ابوعزیز بن عمیر خود ایک قیدی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ بعض انصاری مسلمانوں کے حوالے کئے گئے۔ قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی نبوی ہدایات کا مسلمانوں پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان میں سے کسی مسلمان کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو وہ بھی مجھے دے دیتا۔ ان کے رویہ سے مجھے حد درجہ شرمندگی اور ندامت محسوس ہوتی تھی۔

قیدیوں کے مسئلہ میں رائے مشورہ ہوا تو بعض نے قتل کر دینے کی بات کہی اور بعض نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کی بات کہی۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کا مشورہ پسند فرمایا۔ اور قیدیوں سے تاوان کے طور پر معمولی سی رقم لے کر رہا کر دیا۔ اور جو قیدی تعلیم یافتہ رہے ان کا تاوان یہ مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کے جو تابندہ اور درخشاں نقوش چھوڑے ہیں ان کا دھندلا سا نقش بھی تاریخ کی کسی عظیم ترین شخصیت میں ملنا مشکل ہے۔

مکہ مکرمہ جہاں آپؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا تھا اس سے کون صاحبِ علم واقف نہیں۔ لیکن جب اس شہر میں فاتحانہ داخل ہونے کا موقعہ ملا تو اعلان فرمایا:

جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے، بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے کسی زخمی اور قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔ جو شخص بھی اپنے گھر کے دروازے بند کر لے یا حضرت ابوسفیانؓ کے گھر میں پہنچ جائے یا حرم شریف میں داخل ہو جائے تو اس کے لیے امان ہے۔

مکہ فتح ہو چکا ہے آپؐ کے سامنے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو پیش کیا گیا۔ آپؐ نے سب پر ایک نظر ڈالی اور دیکھا تو سارے وہی اشخاص تھے جو کبھی آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے خون کے پیاسے تھے اور ظلم و ستم ڈھانے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ یہ موقع تھا کہ آپؐ اپنی قوت کے بل بوتے پر ہر ایک سے اپنا انتقام لے سکتے تھے اور اس گردن زدنی جماعت سے اپنا بدلہ چکا سکتے ہیں۔ لیکن دفعتاً حرم کی نورانی اور کیف آور فضا میں یہ کلمات بکھر جاتے ہیں۔

اذھبوا فانتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم : جاؤ تم سب آزاد ہو۔ آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

یہ تو رحمتِ عالم کی شانِ بے نظیر تھی اور ان کے سایۂ شفقت میں تربیت پانے والے نفوس کی شان بھی اس سے کچھ الگ نہ تھی۔ اس قسم کے طرز عمل اور کردار سے بھلا ان کے فیض یافتہ کا دامن خالی

کیسے رہ سکتا ہے۔ اس مقام پر صرف خلیفۂ اوّل کے کردار پہ اکتفا کیا جاتا ہے۔ جو بعد کے خلفاء اور سلاطین کے کردار کا پیش خیمہ بنا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہٗ کی سرکردگی میں شام کی طرف ایک لشکر کو بھیجا تو ان الفاظ میں تاکید فرمائی:

لا تخونوا ولا تغدروا ولا تغلّوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلا ولا شيخا كبيرا ولا تذبحوا شاة ولا بقرة ولا بعيرا الا للاكل وسوف ترون باقوام قد فرغوا انفسهم فى صوامع فدعوهم وما فرغوا انفسهم له

خیانت نہ کرو، عہد شکنی نہ کرو۔ مالِ غنیمت نہ چھپاؤ، کسی مقتول کی صورت نہ بگاڑو کسی بچّے، بڑے بوڑھے عورت کو قتل نہ کرو۔ کھجور کے درخت اور پھل دار درخت نہ کاٹو اور نہ انھیں آگ لگاؤ۔ گائے، بکری اور اونٹ کو صرف کھانے کے لیے ذبح کرو اور جو لوگ دنیا سے الگ ہو کر عبادت گاہوں میں مصروفِ عبادت ہیں اُن کو اُن کے حال پہ چھوڑ دو۔

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل انسان صرف جنگ وجدال اور انتقام کے معنے ومفہوم سے واقف تھا اور اس کی لغت میں صلح، امن اور معاہدہ جیسے کوئی الفاظ نہ تھے لیکن آپؐ نے ایسے تاریک دور میں انسانوں کو پیغام دیا کہ بعض حالات میں اگر کی جا سکتی ہے تو صلح بھی ہو سکتی، معاہدے بھی ہو سکتے ہیں اور باہمی دوستیاں اور رابطے بھی قائم کر لیے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ آپؐ کی نیک نیتی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ صلح کی جنھوں نے آپؐ کی مکّی قومیت ختم کر دی تھی۔ اور آپؐ اُس وقت تک شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ مکہ مکرمہ کا کوئی باشندہ آپؐ کو پناہ نہ دے۔ آپؐ اپنے ہی آبائی شہر میں ایک اجنبی شخص کی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک رشتہ دار کی پناہ میں داخل ہوتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں سے ساتھ معاہدہ کرنے میں فیاضی، حزم، عفو ودرگزر کی روشن مثال قائم کی۔

امن معاہدہ کو صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک باہمی صلح رہے گی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آمد ورفت میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدات کئے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک و رواداری اور عدل و انصاف کی جو روشن مثالیں قائم کیں وہ

آنے والے خلفاء و سلاطین کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔ قدس (ایلیا) کے غیر مسلموں کے نام تحریر کردہ عہد نامہ ملاحظہ ہو جس میں ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی تابناک جھلکیاں موجود ہیں۔

ھذا ما اعطیٰ عبداللہ عمر امیر المومنین لاھل ایلیا من الامان اعطاھم امانا لانفسھم واموالھم ولکنائسھم وصلبانھم وسقیمھا وبریئھا وسائرملتھا انه لاتسکن کنائسھم ولاتھدم ولاینقص منھا ولامن حیزھا ولامن صلبھم ولامن شئ من اموالھم ولایکرھون علی دینھم ولایضار احد منھم ۔ یہ وہ عہد ہے جو بندۂ خدا امیر المؤمنین عمر بن خطاب نے قدس کے عیسائیوں کو بطور امان لکھ کر دیا ہے۔ ان کو ان کی جان و مال، عبادت گاہوں اور صلیبوں کے متعلق امن دیا گیا ہے۔ صحیح و سالم ہوں یا شکستہ اور ان کے مذہبی رسومات کے متعلق بھی آزادی دی گئی۔ کوئی مسلمان ان کی عبادت گاہ میں نہ رہے گا اور نہ ان کو منہدم کرے گا اور نہ ہی ان میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی عبادت گاہوں سے متعلق مکانات میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی صلیبوں میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ہی ان کے اموال میں سے کچھ لیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان کو اپنا مذہب چھوڑنے پہ مجبور کیا جائے گا اور نہ کسی کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔

غیر مسلموں کے ساتھ طے ہونے والے عہد ناموں کے شرائط کی پابندی اور معاہدات کا تحفظ بھی سلاطین و خلفائے اسلام کا اہم اور قابلِ تعریف کردار رہا ہے اور اس کردار کی تشکیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تہدید آمیز ہدایات کا عنصر ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: من ظلم معاھدا وانتقصه اوکلفه فوق طاقته او اخذ منه شیأ من غیر طیب نفسه فانا حجیجه یوم القیامة: جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اس پر بوجھ ڈالے یا اس کی رضامندی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے لے تو میں قیامت کے دن اس کا وکیل اور طرف دار رہوں گا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا: من قتل معاھدا لم یرح رائحة الجنة: جو شخص کسی معاہد کو قتل کر دے تو وہ جنت کی بو بھی نہیں سونگھ پائے گا

ان نصیحتوں اور ہدایتوں کا مسلمانوں پر اس قدر غیر معمولی اثر ہوا کہ معاہدات کی میعاد پوری ہونے سے قبل کسی جنگی تیاری کو بھی معاہدہ کی خلاف ورزی خیال کرنے لگے چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق یہ واقعہ ملتا ہے کہ رومی غیر مسلموں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ناجنگ معاہدہ ایک

مدت معینہ تک کے لیے ہوا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اندرونِ معیاد ہی روم کی سرحد کے قریب لشکر جمع کرنا شروع کر دیا تاکہ جیسے ہی صلح کی معیاد ختم ہو جائے دشمن پر حملہ کیا جا سکے۔ اس کارروائی کا علم صحابیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر بن حسبہؓ کو ہوا تو انھوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص کا کسی قوم سری قوم کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو تو اس کی معیاد پوری ہونے سے قبل کسی سامان کو باندھے اور نہ کھولے یا اس معاہدہ کو باقاعدہ واپس کر دیا جائے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ بات سنی تو اسی وقت لشکر کو واپس چلے آنے کا حکم صادر فرمایا۔

حاصل کلام! قرآن کریم، احادیث نبویؐ، تعامل صحابہؓ اور فقہی تصریحات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ اسلام میں غیر مسلموں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ اور ان کی مذہبی آزادی کا پورا پورا پاس و لحاظ موجود ہے۔ پھر بھی یہ الزام دھرایا جائے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ صرف جنگ کی بات کرتا ہے تو اس کو این چہ بوالعجبی ست کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

وما علینا الا البلاغ ••

(بقیہ مضمون "مکتوب حضرت قطب ویلورؒ" ص 46 سے آگے۔)

خواجہ باشاہ صاحب صاحب عقل فہم اور عالی خاندان کے فرد ہیں اور ان کا شمار یہاں کے مشاہیر کرام میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہیں اس قسم کے بے مزہ و ناخوش گوار اور شک و شبہ پر مبنی دستاویزات کے ذریعہ فتنہ و فساد کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ شاید یہ ساری باتیں طرفین کے خدمت گاروں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ لہٰذا آپ ایسے بزرگوں اور ان کے تابعداروں کی اذیت کے درپے نہ رہیں۔ اور یہ مکتوب ملفوف ان کی خدمت میں بھیج دیں امید قوی رکھتا ہوں کہ اس بزرگ کے ذریعہ فتنہ دب جائے گا۔ اور فساد، صلاح کی صورت میں بدل جائے گا۔

انہ علی کل شیء قدیر: اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔

رودادِ دارالعلوم لطیفیہ

ادارہ

الحمدللہ والمنۃ!

اللطیف ــــــ گزشتہ کئی سالوں سے جو دینی و ادبی خدمت انجام دیتا ہوا آرہا ہے یہ کسی سے پوشیدہ نہیں! سالنامہ "اللطیف" اپنی قلیل مدت میں معراجِ ترقی پر پہنچ گیا ہے۔ اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک تک اس کی رسائی ہے۔ دن بدن اس کی مقبولیت اور مانگ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس کے معیاری دل چسپ و پُرلطف مضامین ایک طرف مذہبی ذوق کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں تو دوسری طرف ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں۔ سالنامہ "اللطیف" کا ۳۴ واں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے طلبا و اساتذہ اپنی جد وجہد و جانفشانی میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔

آغازِ سالِ نو

مورخہ ۱۱ر شوال المکرم سنہ ۱۴۱۵ھ سے دارالعلوم کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا۔ اس سال بھی حسبِ عادت جدید طلبا کی کثیر درخواستوں کی وجہ داخلہ میں توسیع کردی گئی۔ موجودہ ناظمین کرام ملت کے زیادہ سے زیادہ نونہالوں کو اپنی پیاس بجھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ جزاھما اللہ ــــ!

افتتاحی اجلاس

طلبائے دارالعلوم کو فنِ تقریر و خطابت کے میدان میں آگے بڑھنے اور اس میں کمال پیدا کرنے کے لیے ہفتہ میں دو اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ایک شبِ جمعہ جس کی صدارت دارالعلوم کے اساتذہ کرام فرماتے ہیں۔ دوسرا صبحِ جمعہ جس کی صدارت منتہی طلبا کے ذمہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عزت مآب حضرت مولانا ابومحمد سید شاہ عثمان پاشا قادری صاحب ایم اے، ناظمِ دارالعلوم

لطیفیہ وقتاً فوقتاً جلسے کی صدارت فرماتے ہیں۔ اور انجمن کے اجلاس میں طلبا کسی نہ کسی ایک عنوان پر تقریر کرتے رہتے ہیں۔

انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس بڑے شان دار پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ جس میں علم دوست حضرات کو بحیثیتِ مہمان خصوصی مدعو کیا جاتا ہے۔ حسبِ عادت انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی جلسہ امسال بھی مورخہ ۱۲؍ ذی قعدۃ الحرام ۱۴۱۵ھ م ۱۳؍ ماہ اپریل ۱۹۹۵ء بروزِ پنجشنبہ مقرر ہوا۔ جس میں دانش کدۂ مدراس کے شعبۂ عربی فارسی و اردو کے پروفیسرس عالی جناب ڈاکٹر سجاد حسین صاحب شعبۂ اردو اور عالی جناب ڈاکٹر محمد مصطفےٰ شریف صاحب شعبۂ عربی، مدعو تھے۔ جنھوں نے خطاب کرتے ہوئے علمِ دین اور دورِ حاضرہ پر روشنی ڈالی۔ ان حضرات کے پُر اثر اندازِ خطابت پر اہلِ مجلس بہت محظوظ ہوئے۔

دورۂ حدیث

بفضلہ تعالیٰ مورخہ ۲۵؍ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ بروز دوشنبہ صحیح بخاری شریف و صحیح مسلم شریف کے دورۂ حدیث کا آغاز دارالعلوم کے وسیع و عریض ہال میں ہوا۔ اور مورخہ ۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ مطابق 18؍ ماہ دسمبر ۱۹۹۵ء روز دوشنبہ فضیلت مآب ناظم دارالعلوم کی دعاؤں پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اسبابِ صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس نعمت عظمیٰ سے بھی دارالعلوم کے طلبا کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بعد نمازِ عصر تا مغرب طلبا کو انٹرنیشنل گیمس کا انتظام کیا گیا ہے۔

نویدِ مسرت

دانش کدۂ مدراس کے امتحاناتِ افضل العلماء اور ادیب فاضل میں امسال بھی ہمارے طلبا نے شرکت کی اور ممتاز و نمایاں نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ الحمد للہ علی ذالک۔

امتحانات:

۲۸؍ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ مطابق 26؍ ماہ آگست ۱۹۹۵ء میں اساتذۂ کرام کی نگرانی میں ششماہی امتحانات شروع ہوئے اور ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ نیز مورخہ ۲۷؍ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ

۱۴۱۶ھ مطابق 21 ر دسمبر 1995ء سالانہ امتحان شروع ہوا اور ایک ہفتہ تک جاری رہا

عبا پوشی و اعطائے اسناد

دارالعلوم کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت عزت مآب حضرت مولانا ابو محمد سید شاہ عثمان پاشا قادری صاحب ایم اے، ناظم دارالعلوم لطیفیہ، مکان حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ نے فرمائی اور خود اپنے دستِ مبارک سے فارغین کو عبا اور اسناد عطا فرمایا۔ نیز اس اجلاس میں مقامی و بیرونی علمائے کرام و حکمائے عظام اور معتقدِ علم دوست حضرات کثیر تعداد میں مدعو تھے۔ فارغین علماء اور مقررین کی تقاریر سے اہلِ مجلس بہت زیادہ محظوظ ہوئے۔

اسی دن شام بعد نمازِ عصر ایک دوسری نشست ہوئی جس میں درسیات و تحریر مقالہ نویسی، مقابلۂ تحریر و تقریر اور گیمس و اسپورٹس میں اول و دوم آنے والے طلبا اور عہدیداران کو جو سال بھر تندہی سے ساتھ خدمات پیش کئے تھے ان تمام کو نفیس و قیمتی انعامات سے نوازا گیا۔

ہدیۂ تشکر

ادارہ ان تمام حکیموں اور ڈاکٹروں کا مشکور و ممنون ہے جو وقتاً فوقتاً ہمارے طلباء و اساتذہ کی صحت کا ہمیشہ خیال کرتے ہوئے ادویات اور مشوروں سے نوازا۔ نیز ان مدیران اخبار کا بھی مشکور ہے جو دارالعلوم کی کارروائیوں کو شائع کرتے رہے۔

بالخصوص ادارہ عالی جناب کاتب محمد شریف صاحب برکاتی آمبور اور عالی جناب سید علیم الدین علیم صبا نویدی صاحب مدراس کا بے حد ممنون و مشکور ہے جنہوں نے کتابت و طباعت کا کام بڑے خلوص اور محنت و جاں فشانی سے انجام دیا۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور سعادتِ دارین نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ●

جواہر القرآن

مولانا حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی استاذ دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور

نحمدہٗ و نستعینہ و نستغفرہٗ و نصلی علی رسولہ الاقوم واصحابہ الاکرم و وارثہ الافخم : امّا بعد

قرآنِ کریم کسی انسان کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے ۔ یہ تو خالقِ ارض وسما کی تخلیق و تصنیف ہے ۔ لہٰذا کماحقہٗ اس کی لطافتوں، حلاوتوں، دقیقتوں، عظمتوں، رفعتوں، خوبیوں اور علوم وفنون کا احاطہ کرنا بشری طاقت کی حدود سے باہر ہے ۔ تاہم بہت سارے اصحابِ قلم اور اربابِ بصیرت نے اپنے اپنے ذوق وفہم اور تدبر وتفکر اور عقل ودرایت کے مطابق ہر دور میں قرآنِ کریم کے لفظی ومعنوی محاسن ولطائف کو نمایاں اور اجاگر کیا ۔ اور آج بھی اس کے حسن وجمال اور کمال کی نئی نئی جہتیں اور نئی نئی سمتیں روشن ہو رہی ہیں اور آنے والے ادوار میں بھی قرآن کریم کے معانی ومطالب اور اس کی صداقت وحقانیت اور اس کے خدائی تصنیف ہونے کے شواہد وامثال کے ابواب کھلتے رہیں گے ۔

قرآن کریم کے مفسّرِ اول خود صاحبِ وحی سیدنا حضور پُرنور محمّدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ منصب آپؐ کو من جانب اللہ تفویض کیا گیا ہے ۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے :۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم : اور ہم نے آپ پر وحی نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر بیان کریں ۔

چناں چہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرام کو نہ صرف قرآن پڑھایا بلکہ اس کے معانی ومطالب اور اس کے احکام ومسائل سے روشناس فرمایا ۔ جیسا کہ ان بزرگوں نے خود اس نعمت کے حصول کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔

تعلمنا القرآن والعلم والعمل جمیعًا : ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم اور اس سے متعلق ساری علمی و عملی باتوں کا علم حاصل کیا۔

اس طرح قرآنِ کریم کو اس کے معانی و مطالب کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے کا نتیجہ تھا کہ بعض صحابہ کرام رضی کو ایک ایک سورت کے سیکھنے میں کئی کئی سال لگ جاتے تھے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی سے متعلق موطا امام مالک کی روایت ہے کہ انھیں صرف سورۃ بقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال کی مدت صرف ہوی۔

حضرات صحابہ رضی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی پڑھا اور سیکھا انہوں نے حضرات تابعین کو پڑھایا اور سکھلا دیا۔ اوران حضرات کرام نے بھی اس علمی اور دینی سرمایہ کو پوری حفاظت وصیانت اور دیانت وامانت کے ساتھ ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اور آج تک بھی یہ عمل نسلاً بعد نسلاً تسلسل کے ساتھ جاری وساری ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ اوران کی قرأت کے طریقوں اور قرآن کے معانی و مطالب کے تحفظ کا سلسلہ قائم ہے۔

قرآن کریم کے معانی کی توضیح، تفسیر کے ذریعہ ہوگی یا تاویل کے ذریعہ، تفسیر ایک چیز ہے اور تاویل ایک چیز ہے اور تاویل سے تفسیر کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ تاویل کرنے والا تفسیر کے اثبات اور اقرار کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے اسرار وغوامض اور حقائق ودقائق کو بطریقِ اشارہ استخراج کرتا ہے۔

تفسیر کے لفظی معنی ہے کھولنا اور اصطلاح میں تفسیر اس کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی ومطالب بیان کئے جائیں اور اس کے احکام اور اس کی حکمتوں کو واضح کیا جائے۔ اور یقین کریں کہ اس کے یہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔ اور یہ بجز شارع علیہ السلام سے بروایت صحیح سننے اور نقل کرنے کے جائز نہیں۔

اور تاویل کے معنی ہیں آیت کے امکانی معانی اور احتمالی مطالب کو بیان کیا جائے اور بلا جزم ویقین کہا جائے کہ اس کی مراد یہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح کی بات کہنا دو قیدوں کے ساتھ درست ہے۔ ایک قانونِ شریعت کی موافقت اور دوسری قوانینِ عربیہ کی مطابقت۔

اور تفسیر سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر تین چیزوں کا لحاظ رکھا جائے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے کلمات میں سے ہر کلمہ کو معنیٔ حقیقی پر، یا اپنے مجازِ متعارف پر محمول کریں۔

اور دوسری چیز یہ ہے کہ اس کلمہ کے سیاق و سباق کا لحاظ رکھیں اور شروع سے آخر تک نظم کلام کا خیال رکھیں کہ کہیں بے ترتیبی اور خلل پیدا نہ ہو۔

اور تیسری چیز یہ ہے کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ جو نزولِ وحی کے شاہد ہیں۔ ان کا سمجھنا اس کے خلاف نہ ہو اور جب ان تینوں امور میں کوئی ایک فوت ہو جائے اور دوسرے دو باقی رہیں تو اس کو تاویلِ قریب کہتے ہیں۔ اور اگر دوسری چیز فوت ہو جائے اور پہلی و تیسری چیز باقی رہیں تو اس کو تاویلِ بعید کہتے ہیں۔ اور جب ان تینوں چیزوں کا مجموعہ ہی فوت ہو جائے تو اس کو تحریف اور مسخ کہتے ہیں۔ معاذ اللہ من ذالک۔

قرآنِ کریم کے تعلق سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی یہ ہے: ان للقرآن ظھر و بطن و حد و مطلع یعنی اس کا ایک ظاہری پہلو ہے اور اس کا ایک باطنی پہلو ہے اور اس کے لیے ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے۔

تفسیرِ قرآن کے باب میں کمالیت اور جامعیت اسی وقت حاصل ہو گی جب کہ دونوں پہلوؤں (ظاہر اور باطن) کی طرف توجہ رہے اور ظاہر پہ باطن کو مقدم نہ کیا جائے اور نہ باطن کو چھوڑ کر صرف ظاہر پہ اکتفا کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مجددِ جنوب حضرت قطبِ ویلورؒ کی یہ تحریر توسط و اعتدال اور توازن و جامعیت کی آئینہ دار ہے جو انھوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدّث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کے حوالہ سے اپنی فارسی تصنیف "فصل الخطاب بین الخطاء و الصواب" اور "غایۃ التحقیق" میں لکھا ہے:۔

" آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فنِ اعتبار کو تدبرِ قرآن کے قریب رکھا ہے۔ جس کی بناء پر ایک دریا رواں ہے۔ یہ علم اعتبار اگرچہ کہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے تاہم اعتبار ایک عمدہ اور عجیب فن ہے۔ جس کے حدود وسیع ہیں۔ تفسیر عرائس، حقائق سلمی، شیخ اکبر اور شیخ الشیوخ سہروردی کا بہت سارا کلام اسی نوع کا ہے۔

اس مقام میں لغزش کا محل اور زیغ و زلل کا مقام یہ ہے کہ ان آیات میں جو اشارات و کنایات واقع ہوئے ہیں ان کے ظاہر و صورت کو ثابت نہ کریں اور صرف ان کے معانی اور مضمرات کے وجود پر اکتفا کر لیں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوئی نعلین نہیں تھے۔ کہ اُن کو نکالنے کا حکم دیا جاتا ہے بلکہ فاخلع نعلیک کے خطاب سے مقصود یہ ہے کہ اپنے ارادے

اور ہمت کی نظر سے دونوں جہاں کو ساقط کردیتا ہے اور اس کے حضور میں حاضری ہے، بلکہ اس مقام میں کوئی موسیٰ، عصا اور فرعون بھی نہیں ہے۔ موسیٰ کنایہ ہے دل سے، عصا کنایہ ہے برہانِ حقیقت سے اور فرعون کنایہ ہے نفس سے۔

یہ طرزِ فکر اور روش فرقۂ باطنیہ اور ملاحدہ کی ہے جو قرآن کے ظواہر کو باطل قرار دیتے ہیں اور ایک ہی آنکھ سے اس عالم کو دیکھتے ہیں اور دوسرے عالم کو دیکھنے سے آنکھ بند کرلیتے ہیں۔

اس کے برخلاف فرقۂ حشویہ کے افراد قرآن کریم کے اسرار کو باطل قرار دیتے ہیں اور حق کا انکار کرتے ہیں۔

اور یہ دونوں گروہ مقام جامعیت کے درجۂ کمال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور طریق حق یہ ہے کہ دونوں جانب نظر رہے۔ اور دونوں خانے آباد و معمور رہیں اور صورت و معنی (یعنی ظاہر و باطن) دونوں ثابت رہیں۔ اور حکمت و شریعت ایک دوسرے کے ساتھ مطابق رہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نعلین نکالنے کا حکم ہوا اور انھیں وادی مقدس میں (جو زمین کا ایک مخصوص حصّہ ہے) حاضری کا حکم ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی پیروی کی اور اس کے ساتھ ساتھ اِسقاطِ کونین کا اشارہ بھی سمجھا۔

اس روش کو اعتبار کہتے ہیں۔ کیوں کہ عبرت سے مراد ظاہر سے باطن کی طرف اور صورت سے معنی کی طرف عبور کرنا ہے اور فاعتبروا یا اولی الابصار کا حکم اس بات کو ثابت کر رہا ہے۔

کوتاہ بین افراد قرآن کریم کے معانی اور مطالب کو ظاہری تفسیر میں منحصر سمجھتے ہیں اور حضرات صوفیہ کے بیان کردہ حقائق و معانی کو تحریفِ قرآنی تصور کرتے ہیں۔

صاحبِ "امحاض النصیحۃ" علامہ فقیہ علی مہایمی گجراتی، شیخ محی الدین ابن عربی پہ تنقید اور طعن کرنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

اس کو کیا ہوگا ہے کہ وہ اس معاملہ میں گدھے کی طرح رینک رہا ہے اور اس عورت کی طرح چیخ و پکار کر رہا ہے، جس کا بچّہ مرچکا ہو اور وہ یہ کہتے پھر رہا ہے کہ شیخ قرآن میں تحریف کررہے ہیں۔ حالاں کہ وہ قرآن کے ظاہری معانی کو بدستور باقی اور برقرار رکھتے ہوئے بطریق اشارہ ان اسرار اور حقائق کا استخراج کرتے ہیں جن کے سمندر کبھی پایاب نہیں ہوتے۔

اور شیخ نے کبھی اس تفسیر باطنی کے ذریعہ تفسیر ظاہری کی نفی نہیں کی۔ بلکہ خود طعن کرنے والے کا مذکورہ اعتراض اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تردید کر رہا ہے۔ ما فرطنا فی الکتاب من

شئی : باوجود یہ کہ ظاہری اعتبار سے قرآنِ کریم میں بہت سے امور نہیں ہیں حالاں کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے قرآن کے اندر کوئی چیز نہیں چھوڑی بلکہ ہم نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔

نیز اس ارشادِ خداوندی کی بھی تردید ہو جاتی ہے : قل لو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا آپ فرما دیجیے! اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی ہو جائے تو قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں سمندر ہی ختم ہو جائے گا۔ اور ایک سمندر کیا اگر ویسا ہی دوسرا سمندر اس کی مدد کو لے آئیں تو بھی اللہ کی باتیں ضبطِ تحریر میں نہ آسکیں گی۔ ایک محدود کتنا ہی وسیع وسیع ترین کیوں نہ ہو جائے لامحدود کو کیسے محیط ہو سکتا ہے۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کی نفی لازم آتی ہے : ان للقرآن ظھرا وبطنا وحدا ومطلعا : بے شک قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور اس کے لیے حدود ہیں اور ان حدود کے لیے ایک مطلع ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ چند آیات کے دوسرے معنیٰ جو صوفیائے کرام کے کشف و تحقیق سے ماخوذ ہیں وہ شریعت سے ہم آہنگ اور اس کے موافق ہیں البتہ ان معانی کے سمجھنے سے اہلِ ظاہر کی عقلیں قاصر ہیں۔ اور کوتاہ نظر ان معانی کو تحریفِ قرآنی تصور کر رہے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ان من العلم کھیئۃ المکنون لا یعلمہ الا العلماء باللہ : بے شک بعضے علوم پوشیدہ صورت ہیں جن سے عارف باللہ نفوس ہی واقف ہوتے ہیں۔

اور اصل حقیقت یہی ہے کہ جب یہ حضرات ان علوم و معارف اور حقائق کو اپنی زبانوں پر لاتے ہیں تو وہی لوگ ان علوم کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محروم ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ علمائے سلف، اہلِ استعداد ہی کو ان حقائق و معارف کی طرف رہ نمائی کرتے تھے، اور نااہل کو ان چیزوں سے باز رکھتے تھے۔ اور یہ کہا کرتے تھے کہ جس نے یہ دولتِ علم کسی نااہل کو عطا کی تو گویا اس نے یہ نعمت ضائع کر دی اور جس نے کسی صاحبِ استعداد سے اس نعمت کو چھپایا تو ظلم کیا۔"

غرض قرآن کے علوم و معارف اور اس کے لطائف و غرائب ایک بحرِ بیکراں کی طرح ہے۔ علماء و فضلا اپنے اجتہاد و استنباط کے ذریعہ اور اولیاء و اصفیاء اپنے

کشف والہام کے ذریعہ نتائج وافکار اور اسرار و نکات کی نشان دہی کرتے رہیں گے۔ لیکن یہ تفسیرات و تاویلات، انکشافات والہامات اور تعبیرات اسی وقت لائقِ اعتناء اور قابلِ التفات ہوں گے جب کہ وہ کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اقوال صحابہؓ و تابعین اور لغت کے اصول سے متصادم اور خلاف نہ ہوں۔ اسی لیے قرآنِ کریم کی تفسیر اولاً قرآن کریم ہی سے کی جائے گی۔ کیوں کہ اس کی بعض آیات مختصر اور مجمل ہیں تو خود دوسری آیات ان کی تفسیر کر دیتی ہیں مثلاً سورۃ فاتحہ کی اس آیتِ طیبہ صراط الذین انعمت علیھم: (اے اللہ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر گامزن فرما جن پر تو نے انعام واکرام کیا۔) کی تفسیر سورۃ النساء کی اس آیت میں موجود ہے: اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین و الشھداء والصالحین: جن لوگوں پر اللہ تعالےٰ کا انعام ہوا وہ انبیاء کرام، صدیقین شہدائے عظام اور اولیاء اللہ ہیں۔

ثانیاً قرآنِ کریم کی تفسیر احادیث سے کی جائے گی۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیٔ رسول حضرت معاذ ابن جبلؓ کو دعوت و تبلیغ کے لیے یمن بھیجا تو اس وقت ان سے پوچھا کہ تم احکام کس طرح بیان کروگے؟ انہوں نے عرض کیا: قرآنِ کریم کی روشنی میں۔ حضور اکرم صلعم نے پوچھا: اگر کوئی حکم قرآن میں نہ پاؤ تو کیا کروگے؟ انہوں نے عرض کیا: احادیث کی روشنی میں احکام بیان کروں گا۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اگر احادیث میں بھی نہ پاؤگے تو کیا کروگے؟ انہوں نے عرض کیا: ایسی صورت میں اجتہاد کروں گا۔

یہ جواب سن کر ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور فرمایا: اے اللہ تعالےٰ کا شکر ہے۔ اس نے اپنے نبیؐ کے قاصد کو اس بات کی توفیق عطا کی۔ جو اس کے نبیؐ کو پسند ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں موجود ہے۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام لمعاذ بن جبل حین بعثہ الی الیمن قال بم تقضی یا معاذ؛ قال بکتاب اللہ تعالیٰ: قال فان لم تجد: قال بسنّۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قال فان لم تجد: قال، اجتھد برأیی فصوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ علی ما یحب ویرضاہ (اصول الشاشی)

ثالثاً قرآنِ کریم کی تفسیر صحابۂ کرام کے اقوال و آراء سے کی جائے گی۔ کیوں کہ یہ حضرات کرامؓ صحبتِ نبویؐ کی برکت اور فیض سے سراپا تقویٰ و طہارت تھے۔ اور علم صحیح، فہم درست اور عمل نیک کے مالک تھے۔ اور قرآنی آیات کے پس منظر، قرائن اور احوال سے بخوبی واقف اور آشنا تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

بخدا! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں کہ میں نہ جانتا ہوں کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوی اور کس موقع پہ نازل ہوی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ قرآن کریم کے علم میں مجھ سے زیادہ کوئی شخص علم رکھنے والا ہے اور اس تک رسائی ممکن ہے تو میں ضرور اس سے استفادہ کے لیے پہنچ جاتا۔

یہی وہ ابنِ عباس ہیں جن کے حق میں خصوصیت کے ساتھ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی: اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل: خدایا! انہیں دین کی سمجھ اور فہم عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما۔

رابعاً قرآن کریم کی تفسیر حضرات تابعینؒ کے اقوال و آراء کی روشنی میں کی جائے گی۔ گروہِ تابعین میں حضرت مجاہد کو علم تفسیر میں غیر معمولی درک اور انتہائی بصیرت حاصل ہے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں: میں نے تین مرتبہ قرآن کریم از اول تا آخر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پڑھا۔

خامساً قرآن کریم کی تفسیر حضرات تبع تابعین کے اقوال و آراء سے اور آئمہ مجتہدین کے اجتہاد و استنباط اور اصحابِ تدبّر کی عقل و درایت اور عربی ادب و لغت کی روشنی میں کی جائے گی جب کہ یہ پانچویں صورت مذکورۃ الصدر چار صورتوں سے ہم آہنگ رہے۔

اس مقام پہ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں اپنی ذاتی رائے اور اپنے خیال کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تفسیر کو رائے کے ذریعہ بیان کرنے سے سخت منع فرمایا: چناں چہ مشکوٰۃ کی حدیث ہے: من قال فی القرآن برایۃ فلیتبوٴ مقعدہ فی النار: جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

اسی تہدید و تاکید کا اثر تھا کہ بعض اہلِ علم صحابہ کرامؓ اس بات میں بہت سختی کرتے تھے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر علم کی جائے۔ چناں چہ ترمذی کتاب التفسیر میں مرقوم ہے: روی عن بعض اھل العلم من اصحاب النبی علیہ السلام وغیرھم انھم شدّدوا فی ھذا ان

یفسر القرآن بغیر علم۔

ایک دوسری حدیث میں یہ کہا گیا ہے قرآن میں رائے کے ذریعہ درست بات بھی غلط ہے۔ من قال فی القرآن برایۃ فاصاب فقد اخطاء : جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کوئی اچھی بات بھی کہہ گیا تو بھی اس نے غلطی کی۔

صاحب مرقات تفسیر بالرائے کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

ای تکلم فی معناہ اوفی قراتہ من تلقاء نفسہ من غیر تتبع الاقوال الائمۃ من اھل اللغۃ والعربیۃ للقواعد الشرعیۃ بل بحسب ما یقتضیۃ عقلہ وھو مما یتوقف علی النقل کاسباب النزول والناسخ والمنسوخ

قرآن کریم کے معانی ومطالب یا اس کی قرأت میں اپنی رائے سے کلام کرے اور عربی لغت وادب کے ائمہ کرام کی تصریحات اور شریعت مطہرہ کے قواعد کا لحاظ کئے بغیر اپنی عقل اور رائے سے جو چاہے کہہ دے، حالاں کہ یہ معانی ومطالب ویسے ہیں جن کا سمجھنا نقل پر موقوف ہے جیسے کہ شان نزول اور ناسخ ومنسوخ۔

تفسیر جلالین کے حاشیہ جمل میں تفسیر بالرائے کے ناجائز ہونے کی وجہ اس طرح بیان کی گئی ہے :۔

ان التفسیر کشھادۃ علی اللہ قطع بانہ عنٰی بھذا اللفظ وھذا المعنی ولا یجوز الا بتوقیف و لذا جزم الحاکم بان تفسیر الصحابی فی حکم المرفوع :

تفسیر بالرائے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر خدائے پاک پر گواہی دینا ہے اور اس بات کا یقین کرنا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کلمہ کے یہی معنی مراد لئے ہیں اور یہ بغیر بتائے جائز نہیں۔ اس لیے حاکم نے فیصلہ کر دیا کہ صحابیؓ کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

مذکورہ توضیحات سے معلوم ہوا کہ تفسیر کہتے ہی ہیں ان احوال کے بیان کرنے کو جو عقل سے معلوم نہ ہو سکیں۔ اور ان میں نقل کی ضرورت ہو جیسا کہ کسی آیت کا شان نزول یا کسی آیت کا ناسخ ومنسوخ ہونا اور ظاہر ہے کہ جن باتوں کا علم نقل کئے بغیر نہیں ہو سکتا ان کو کیوں کر رائے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسی کیے ساتھ ساتھ تفسیر بالرائے کو ممنوع قرار دینے کی حکمت اور مصلحت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کوئی شخص قرآن کو اپنی ٹھہرائی ہوئی رائے اور اپنے قائم کردہ موقف کے

مطابق ڈھالنے کی سعی نہ کرنے اور کتاب وسنت اور صحابہ کی تفسیرات اور لغت کے اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن کو کھینچ تان کر اپنی رائے کا مؤید نہ ٹھہرالے اور اس طرح تحریف کا دروازہ نہ کھل جائے۔

ان تفاصیل سے یہ معنی ومفہوم اخذ نہ کیا جائے کہ قرآن کے مطالب میں غور وفکر اور عقل و درایت سے کام لینے کی راہ مسدود کر دی گئی ہے۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔کیوں کہ خود قرآن نے اس موضوع کی طرف ان الفاظ میں رہنمائی کی ہے:

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کے ذریعہ قرآن کے اسرار ونکات اور دقائق کو پیش کرنے کی کوئی گنجائش باقی رکھی گئی ہے لیکن یہ ان حضرات کے لیے ہے جو اصحاب بصیرت اور ارباب علم ہوں۔ چناں چہ مشکوٰۃ کتاب القصاص میں مرقوم ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی کوئی علم ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

ماعندنا الامافی القرآن الافھما یعطی رجل فی کتابہ: ہمارے نزدیک قرآن کے سوا کچھ نہیں ہے الّا یہ کہ وہ علم وفہم اور بصیرت ہے جو کسی کو قرآن کے متعلق عطا کر دی جاتی ہے۔

صاحب مرقات نے اس امر کی وضاحت یہ فرمائی ہے: المراد منہ ما یستنبط بہ المعانی ویدرک بہ الاشارات والعلوم الخفیۃ

اس فہم ودرایت اور تعقل سے مراد وہ علم ہے جس سے قرآن کے معنی مستنبط کئے جائیں اور جس سے اشارات معلوم ہوں اور پوشیدہ علوم کا سراغ لگے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ علم تفسیر ایک انتہائی دقیق اور نازک ترین موضوع ہے۔ اس کو اتنا سہل اور آسان نہ ٹھہرالیں کہ اس کے متعلق جو قیودات اور شرائط ہیں اور صحابۂ کرام وسلف صالحین کی جو احتیاطیں ہیں ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر کوئی اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی تحقیق کو تفسیر قرآن کا نام دے لیں۔ ●●

[جاری]

جواہر الحدیث



مولانا ابوالنعمان حافظ بشیر الحق قریشی قادری لطیفی۔ مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مسئلہ تقدیر سے متعلق چند احادیث اور ان کی تشریحات پیش کی جارہی ہیں۔ یہ مسئلہ ایمانیات اور اعتقادات سے جڑا ہوا ہے اس کو عقلی اور نظری طور پر سلجھانے کی سعی و کوشش کرنا گویا خود کو خلش و خلجان اور اضطرار و اضطراب کے بھنور میں جھونک دینا ہے۔ اسی لیے اہلِ سنت وجماعت نے یہ موقف اختیار کیا کہ خیر اور شر ہر دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور اس مسئلہ پر غور وفکر، بحث ومباحثہ اور گفتگو ممنوع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

تؤمن بالقدر خیرہ وشرہ: یعنی ہر خیر وشر کی تقدیر کو بھی حق جانو اور حق مانو۔

حدیثِ جبرئیل کے مذکورہ اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ تقدیر کی اچھائی اور برائی پر ایمان لانا بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اذا ذکر القدر فانصتوا: جب تقدیر کی بات آجائے تو خاموشی اور سکوت اختیار کرو۔

مسئلہ تقدیر کے باب میں اہلِ سنّت وجماعت کا موقف یہ بھی ہے کہ انسان پوری طرح مجبور بھی نہیں ہے اور پوری طرح مختار بھی نہیں ہے اور یہی میانہ روی اور اعتدال کی توازن اور

جامعیت برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو مختار کل یا مجبور محض قرار دینے میں بہت ساری پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔

عن ابی ھریرۃ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن فتنازع فی القدر فغضب حتی احمر وجھہ حتی کانما فقئ فی وجنتیہ حب الرمان فقال ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت الیکم انما ھلک من کان قبلکم حین تنازعوا فی ھذا الامر عزمت علیکم عزمت علیکم ان لا تنازعوا فیہ : (جامع الترمذی)

امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے مسئلہ تقدیر پر بحث کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہماری بحث کو سن کر انتہائی غضبناک ہوئے یہاں تک کہ چہرۂ انور سرخ ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے رخساروں پر انار نچوڑ دیا گیا ہے۔

پھر آپؐ نے ہم سے فرمایا: کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ قضاء و قدر کے مسئلہ میں بحث کرنے بیٹھو۔ خبردار! تم سے پہلے کی اُمتیں اسی وقت گمراہ ہو گئیں جب کہ انہوں نے اس مسئلہ میں بحث و مباحثہ اور غور و فکر کو اپنا طریقہ بنا لیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں اور میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ تم لوگ اس مسئلہ میں ہرگز کلام نہ کرو۔

عن ابن الدیلمی قال اتیت ابی ابن کعب فقلت لہ قد وقع نفسی شئ من القدر فحدثنی لعل اللہ ان یذھبہ من قلبی، فقال لو ان اللہ عذب اھل سمٰواتہ واھل ارضہ عذبھم وھو غیر ظالم لھم ولو رحمھم کانت رحمتہ خیرا لھم من اعمالھم ولو انفقت مثل احد ذھبا فی سبیل اللہ ما قبلہ اللہ منک حتی تومن بالقدر وتعلم ان ما اصابک لم یکن لیخطئک وان ما اخطاک لم یکن لیصیبک ولومت علی غیر ھذا لدخلت النار۔ قال ثم اتیت عبد اللہ بن مسعود فقال مثل ذالک ثم اتیت زید بن ثابت فحدثنی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مثل ذالک۔ (ابو داؤد)

ابن دیلمی فرماتے ہیں کہ میں ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ میرے قلب میں مسئلہ تقدیر سے متعلق کچھ وسواوس اور خیالات پیدا ہوئے ہیں آپ اس مسئلہ پر کچھ

وضاحت فرمائیں کہ میری خلش اور خلجان دور ہو سکے۔

انہوں نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ اپنے زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو عذاب میں ڈال دے تو بھی وہ اپنے اس عمل میں ظالم نہ ہوگا۔ اور اگر ان سب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے تو اس کی یہ رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی۔ یعنی ان کے اعمال کا واجب حق نہیں بلکہ اس کا فضل و کرم ہوگا۔ کیوں کہ اعمال کی صحت اور اخلاص کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اور اگر تم اللہ کی راہ میں کوہ احد کی مقدار میں سونا خیرات کر دو تو بھی تمہارا یہ عمل اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ نہ ہوگا۔ جب تک کہ تم اللہ کے قضا و قدر پر ایمان نہ لاؤ۔ اور تمہارا یہ اعتقاد نہ ہو کہ تمہاری زندگی میں جو کچھ پیش آنا ہے تم اس سے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتے اور جو حالات تم پر پیش نہیں آنے والے وہ تمہارے اوپر آ ہی نہیں سکتے۔ (مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو کچھ مقدّر فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس سے رہائی ناممکن ہے۔) اور اگر تم اس کے خلاف (یعنی تقدیر کی اچھائی اور برائی منجانب اللہ ہے) اعتقاد رکھتے ہوئے دنیا سے چل بسے تو یقیناً دوزخ میں چلے جاؤ گے۔

ابنِ دیلمی فرماتے ہیں: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے تقدیر سے متعلق یہ باتیں سننے کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی مجھ سے یہی بات کہی۔ پھر اس کے بعد حضرت حذیفۃ الیمان کی خدمت میں جا پہنچا تو انہوں نے بھی مجھ سے یہی بات کہی۔ پھر اس کے بعد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فرمان کے طور پر مجھ سے بیان فرمائی۔

مذکورہ دو حدیثوں سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ تقدیر کے مسئلہ پر بحث نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر کسی کے قلب میں وسوسہ اور خلش پیدا ہو جائے تو کسی صاحبِ علم و ایمان ہی استفادہ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابنِ دیلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا طرزِ عمل رہا ہے۔ اور قضا و قدر کے بارے میں مضبوط یقین اور پختہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ہماری زندگی میں جو بھی اچھے یا برے حالات اور واقعات رونما ہوں گے وہ سب مشیتِ الٰہی اور تقدیرِ الٰہی کے مطابق ہیں۔ مسئلہ تقدیر سے متعلق حضرت ابی ابن کعب حضرت حذیفۃ الیمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ہم خیال گفتگو سے یہ نتیجہ

اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ کی اکثریت بھی یہی فکر و خیال رکھتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب:

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ وسلم کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنۃ: (مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں۔

عن ابن مسعود قال حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو الصادق المصدوق ان خلق احدکم یجمع فی بطن امہ اربعین یوماً نطفۃ ثم یکون علقۃ مثل ذلک ثم یکون مضغۃ مثل ذلک ثم یبعث اللہ الیہ ملکاً باربع کلمات فیکتب عملہ واجلہ ورزقہ وشقی او سعید ثم ینفخ فیہ الروح فوالذی لا الہ غیرہ ان احدکم لیعمل بعمل اھل الجنۃ حتی مایکون بینہ و بینھا الا ذراع فیسبق علیہ الکتاب فیعمل بعمل اھل النار فیدخلھا وان احدکم لیعمل بعمل اھل النار حتی مایکون بینہ وبینھا الا ذراع فیسبق علیہ الکتاب فیعمل بعمل اھل الجنۃ فیدخلھا۔ (بخاری)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ کے صادق و مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادہ تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اس کے بعد چالیس روز تک منجمد خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اس کے بعد چالیس روز تک مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) کی شکل میں رہتا ہے (تخلیق کے اس مرحلہ میں انسان کے اعضاء کی تشکیل اور ہڈیوں کی بناوٹ و ساخت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔) پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو چار چیزیں دے کر بھیجتا ہے۔ اور یہ فرشتہ پیدا ہونے والے انسان کے اعمال، اس کی عمر کی مدت اور اس کی موت کا وقت اور اسکا رزق اور اس کے نیک بخت یا بدبخت ہونے کو لکھ دیتا ہے۔

پھر اس کے بعد اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔ پس اس ذات کی قسم جس کے سوا عبادت

عبادت و پرستش کے لائق نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جنت اور اس کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پھر نوشتۂ تقدیر غالب آجاتا ہے تو وہ دوزخیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور انجام کار دوزخ میں چلا جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوزخیوں سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دوزخ اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے تو وہ جنتیوں کے سے عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور آخر کار جنت میں چلا جاتا ہے۔

عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامن احد الا وقد کتب مقعدہ من النار ومقعدہ من الجنۃ قالوا یارسول اللہ! افلا نتکل علی کتابنا وندع العمل قال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ اما من کان اھل الشقاوۃ فسیر لعمل الشقاوۃ ثم قرأ۔ فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری۔ واما من بخل واستغنی وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری۔ (مسلم)

علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا بیان ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر شخص کا جنتی ہونا یا دوزخی ہونا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے۔ یہ سن کر صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! تو کیوں نہ ہم نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں اور سعی وعمل کو چھوڑ دیں؟ یعنی جب پہلے ہی ہر شخص کے جنت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر عمل سے کیا فائدہ؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! عمل کرتے رہو۔ کیوں کہ ہر ایک کو اسی کی توفیق اور ہدایت ملتی ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ جنت میں جانے کے لیے اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے اور دوزخ میں جانے والے کے لیے اعمالِ فاسدہ کی توفیق ملتی ہے۔

اس کے بعد سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

فامامن اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری وامامن بخل واستغنی وکذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری

جس کسی نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور تقویٰ اختیار اور اچھی بات (اسلام) کی تصدیق کی تو ہم اس کو جنت حاصل کرنے کی توفیق و ہدایت دیں گے اور جس کسی نے بخل سے کام لیا اور

مغرور اور بے پرواہ رہا اور اچھی بات (اسلام) کو جھٹلایا تو ہم اس کو دوزخ کی طرف چلنا آسان کر دیں گے۔

عن ابی خزامۃ عن ابیہ قال قلت یارسول اللہ ارایت رُقی نسترقیھا و دواءِ نتداوی بہ وتقاۃ نتقیھا۔ ھل ترد من قدر اللہ شیئاً؟ قال ھی من قدر اللہ۔ (ترمذی)

ابو خزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! جھاڑ پھونک کے وہ طریقے جن کو ہم استعمال کرتے ہیں اور وہ دوائیں جن سے ہم علاج کرتے ہیں اور وہ تدبیریں اور کوششیں جن کو ہم اپنے بچاؤ اور فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں کیا یہ جھاڑ پھونک، دوائیں، تدبیریں اور کوششیں، اللہ تعالےٰ کے قضا و قدر کو لوٹا دیتی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمام چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہیں۔

مذکورہ احادیث سے تین باتیں معلوم ہو رہی ہیں:۔

ایک یہ کہ تقدیر الٰہی کے تحت یہ طے شدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں اعمالِ صالحہ انجام دے گا یا اعمالِ فاسدہ کا مرتکب ہوگا اور اس کی عمر کتنی ہوگی اور اس کا رزق کتنا اور کیسا ہوگا؟ اور وہ نیک بخت ہوگا یا بدبخت ہوگا اور وہ جنّت میں داخل ہوگا یا دوزخ میں چلا جائے گا؟

دوسری یہ کہ ہم کسی شخص کو بُرے اعمال میں مبتلا دیکھ کر اس کو دوزخی اور جہنمی نہیں کہنا چاہیے۔ کیا عجب ہے کہ نوشتۂ تقدیر اس طرح سامنے آجائے کہ وہ نیکی کی راہ پر گامزن ہو جائے اور جنّتی قرار پائے اور اسی طرح کسی شخص کو اعمالِ خیر کی جانب راغب اور میلانِ طبع دیکھ کر جنّتی قرار دیتے ہوئے مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے حسنِ خاتمہ کے لیے فکر مند رہنا چاہیے۔ کیا عجب ہے کہ نوشتۂ تقدیر یوں غالب آجائے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں دوزخیوں کے اعمال کا مرتکب ہو جائے اور دوزخی قرار پائے۔

تیسری یہ کہ آدمی یہ سوچ کر کہ تقدیر میں جو کچھ ہے وہی ہو کر رہے گا، عمل کا سلسلہ منقطع نہیں کرنا چاہیے۔

مسئلہ تقدیر میں یہ بات بھی تشریح اور توجّہ کی مستحق ہے کہ آیا کسی آدمی کی لکھی ہوئی تقدیر میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟ اور اللہ تعالےٰ کسی آدمی کی تقدیر کے لکھے کو بدل بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

اس کے لیے ہمیں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے : قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یمحوا اللہ ما یشآء و یثبت وعندہٗ ام الکتاب[1] :

اللہ تعالیٰ جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہے باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہٗ مذکورہ آیت کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ کہ ہر انسان کی عمر اور رزق متعین اور مقرر ہے اور اس کے سعادت مند یا بدبخت ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تاہم اللہ تعالےٰ اس نوشتۂ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں۔

اور یہ تفسیر خالق دوجہاں کی قدرت و سطوت، طاقت و غلبہ اور ہر شئے کے اوپر احاطہ و وسعت کو دیکھتے ہوئے صحیح نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے اور وہ اپنی بنائی ہوئی قضاء و قدر کا پابند تھوڑی ہے۔ ان اللہ یحکم ما یرید وانہ علی ما یشاء قدیر۔

اس موقف کی تائید ان احادیث کے ذریعہ بھی ہو رہی ہے۔ لا یرد القضا الا الدعا و لا یزید العمر الا فی بر الوالدین: قضا و قدر کو کوئی چیز بھی بدل نہیں سکتی لیکن دعاؤں کے ذریعہ تقدیر بدل جائے گی اور عمر میں کوئی اضافہ نہیں لیکن والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی کرنے کی وجہ سے عمر بڑھا دی جائے گی۔

مسند احمد کی روایت میں ہے بعض اوقات کسی گناہ کی وجہ سے آدمی رزق سے محروم کر دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے : ابنِ آدم کے گناہوں کی وجہ سے چرند، پرند اور درند کی روزی میں کمی کر دی جاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ صلۂ رحمی (رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی سے پیش آنا) اور صدقات و خیرات کی وجہ سے رزق اور عمر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی روایت ہے:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب یبسط لہ فی رزقہ وینشأ فی اثرہ فلیصل رحمہ :

---

[1] ام الکتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہر انسان کی زندگی میں جو بھی احوال اور واقعات رونما ہونے والے ہیں ان سب کو مناسب شکل و صورت اور قدر کے ساتھ موجود رکھا ہے ۔۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کے نشانات قدم میں تاخیر کی جائے تو اس کو چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ جس شخص کی جتنی زیادہ عمر ہوگی اسی قدر زیادہ زمانہ تک اس کے پاؤں کے نشانات زمین پر پڑتے رہیں گے اور مرنے کے بعد نشانات قدم بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نشاناتِ قدم میں تاخیر کئے جانے سے مراد عمر کی درازی ہے۔

بعض اہل علم نے درازیٔ عمر سے خیر و برکت مراد لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی کرنے والے شخص کی عمر میں اس قدر برکت عطا فرماتے ہیں کہ جو کام دوسرے لوگ مہینوں اور سالوں میں کرتے ہیں، وہ کچھ ہی دن میں کر گزرتا ہے اور اس کے تمام امور و معاملات میں خیر و برکت اور بھلائی عطا فرماتا ہے۔

بعض اہلِ علم نے درازیٔ عمر سے ذکرِ خیر مراد لیا ہے کہ اس شخص کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی لوگوں کی زبانوں پر اس کا ذکر جاری رہتا ہے۔ جیسا کہ اولیاء اللہ کا ذکر۔

اور بعض اہلِ علم نے درازیٔ عمر سے خاص عمر ہی کی زیادتی مراد لی ہے۔ چناں چہ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ملک الموت علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوب صورت و نیک سیرت نوجوان وہاں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی بڑی تعریف و توصیف کی۔ حضرت ملک الموت نے کہا: آپؑ کا ارشاد بجا ہے۔ لیکن اب اس کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا ہے کہ سات روز گزرنے کے بعد اس کی روح قبض کر لی جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اس خبر سے بڑا غم ہوا۔ سات دن گزرنے کے بعد آپؑ نے دیکھا کہ وہی نوجوان چلا آرہا ہے۔ تو بہت متعجب ہو گئے۔ پھر دل میں خیال کیا شاید مجھ کو سننے میں غلطی ہوی ہو۔ ملک الموت نے سات ماہ یا سات برس کہا ہو:

جب پھر ملک الموت سے ملاقات ہوی تو انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بتایا کہ اس جوان کی عمر فی الواقع ایک ہفتہ تک ہی تھی، لیکن اس نے اپنی وفات کے دن فقراء و مساکین پر صدقہ و خیرات کیا۔ فقراء نے اس کے لیے دعا کی جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی سات دن کی عمر کو سات سال سے بدل دیا۔ ان اللہ یحکم ما یرید۔

مذکورہ تفصیلات کے ذریعہ صدقات و خیرات، دعا اور والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کے عمل سے انسان کی عمر میں اضافہ اور اس کے رزق میں وسعت و کشادگی کا سبب مل رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آدمی کی تقدیر میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ

قلم تو سو کھ چکا ہے اور قدر میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اس اشکال کا دفع یہ ہے کہ تقدیر دو طرح کی ہے ایک تقدیرِ معلق اور ایک تقدیرِ مُبرَم۔

تقدیرِ معلق کے اعتبار سے تبدیلی ہے اور تقدیرِ مُبرَم کے اعتبار سے تبدیلی نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرشتوں کے علم کے اعتبار سے تبدیلی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں نیکی کی وجہ سے بندہ کی عمر میں اضافہ ہو گیا اور فلاں نیکی کی وجہ سے بندہ کے رزق میں اضافہ ہو گیا اور فلاں گناہ کی وجہ سے بندہ کے رزق میں کمی ہو گئی۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے اس کی عمر مشروط تھی کہ اگر بندہ نے فلاں نیکی کرلی تو اس کی مقررہ عمر میں اضافہ کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے اس کا رزق مشروط تھا کہ اگر بندہ نے فلاں نیکی کرلی تو اس کے رزق میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تقدیر میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے۔ جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے اور بعض اوقات لکھی ہوئی نہیں ہوتی اس لیے جب کسی حکم یا واقعہ میں تبدیلی ہوتی ہے تو حیران رہ جاتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی علم ہے کہ بندہ وہ نیکی کرے گا یا نہیں کرے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علم کے لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں اور یہی تقدیرِ مُبرَم ہے اور فرشتوں کے علم کے اعتبار سے تبدیلی ہوئی اور یہی تقدیرِ معلق ہے۔

اس مقام پر مجدّدِ جنوب حضرت علّامہ قطب ویلور علیہ الرحمہ کے عالمانہ و صوفیانہ فتویٰ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے جو اس موضوع پر کافی اور شافی ہے اور اسی اللطیف کے اگلے صفحا پر پھیلا ہوا ہے۔

حاصلِ کلام!

تقدیر کا مسئلہ انتہائی دقیق اور انتہائی نازک ہے لہٰذا ہمیں یہ ایمان اور اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو بھی ہماری زندگی میں پیش آرہا ہے وہ قضا و قدر کی وجہ سے ہے۔ اور عبدیت کی شان بھی یہی ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ اور آقا کی جانب سے جو کچھ بھی پیش آرہا ہے اس کو رضا و خوشی اور صبر و ضبط اور شکر کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔

وما علینا الا البلاغ ●●

اہم فتویٰ

قدوۃ السالکین عمدۃ الکاملین، مجدّدِ جنوب حضرت علّامہ
شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہ

مجدد جنوبی ھند حضرت قطب ویلور علیہ الرحمہ نے مرزا سردار بیگ صاحب حیدرآبادی اور میر احسن اللہ صاحب حیدرآبادی کے استفسار پر درج ذیل فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔ جس میں مفتی موصوف نے انسان کے مختار اور مجبور ہونے پر عالمانہ او صوفیانہ بحث کی ھے۔ فارسی متن ترجمہ کے ساتھ ھدیۂ ناظرین ھے۔

مترجم ابو النعمان غفرلہٗ

از مسئلہ جبر و اختیار استفسار و اشعار رفتہ بود۔

کرم اطوار! جبر چہار است: جبر بالجزئی و ایں ضد اختیار است۔ سالک را در بدایت حال یقین باید دانست کہ نفس او را اختیاری ہست کہ امر و نہی و وعد و وعید بران متفرع است۔ ان النفس لامارۃ بالسوء۔ امر بے اختیاری نمی باشد۔ اگرچہ ایشاں حقیقۃً مجبور اند و از خود آگاہی ندارند۔

آپ نے انسان کے مجبور اور مختار ہونے کا مسئلہ دریافت کیا تھا۔

جبر کی چار صورتیں اور حیثیتیں ہیں (پہلی صورت) جبر جزئی ہے اور یہ اختیار کی ضد ہے۔ سالک کو حال کی شروعات ہی میں یقین کر لینا چاہیے کہ اس کے نفس کو ایسا اختیار ہے جس کی وجہ سے اس کے اوپر امر و نہی اور وعد و وعید کے احکام عائد ہوتے ہیں۔ بے شک نفس برائی کا حکم دیتا ہے اور حکم اختیار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ کہ در حقیقت

دوم جبر یقین و آن در مرتبۂ توحید افعال است۔

انسان مجبور ہے اور خود سے آگاہی نہیں رکھتا ہے

سیوم جبر تخلق و آن در مقام توحید صفات است و متوسطان درین مرتبۂ مجبوریت خود را مشاہدہ می نمایند۔

دوسری صورت جبر یقین ہے اور یہ توحید افعال کے مرتبہ میں ہے تیسری صورت جبر تخلیق ہے اور یہ توحید صفات کے مرتبہ میں ہے اور متوسط اشخاص اس مرتبہ میں اپنی مجبوریت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چہارم بالاتر ازیں سہ جبر، جبر کلی است و آن را جبر تحقق خوانند و آں در مرتبۂ بقاء بعد الفناء اخص خواص را دست دہد۔

چوتھی صورت جبر کلی ہے جس کو جبر تحقق کا نام دیا گیا ہے اور یہ جبر کلی مذکورہ تینوں جبر (جبر جزی، جبر یقین، جبر تخلق) سے فائق اور بالاتر ہے۔

دراین مرتبہ جبر و جابر و مجبور یکے باشد، باز این جا اختیارے روے می نماید چناں چہ در بدایت مختار بود

اور یہ فنا کے بعد بقا کے مرتبہ میں اخص الخواص کو حاصل ہوگا اور اس مرتبہ میں جبر و جابر اور مجبور ایک ہونگے پھر اس مقام پر ایسا اختیار حاصل ہوگا جو مختار کو اس کے بدایت حال میں حاصل تھا۔

مثنوی

- جملہ عالم مقر اختیار
  امر و نہی آں بیار و آں میار
- جبریش گوید کہ امر و نہی لاست
  اختیارے نیست آں جملہ خطا است
- در خرد جبر از قدر رسوا تر است
  زآن کہ جبرے حسِ خود را منکر است
- اختیارے ہست ما را بے گماں
  حس منکر را بیانی شد عیاں
- سنگ را ہرگز نگوید کس بیا
  از کلوخی کس کجا جوید وفا

اختیار کا سارا جہاں قائل اور معترف ہے
حکم دینا کہ یہ لاؤ اور منع کرنا کہ وہ نہ لاؤ
جبر کے قائل کا یہ کہنا کہ امر و نہی بے معنی بات ہے
انسان کو کوئی اختیار ہی نہیں یہ کہنا خطا اور غلط ہے
عقلاً جبر، قدر سے زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ جبری اپنے حس و حرکت کا منکر ہے۔
بلا شک و شبہ ہمیں اختیار حاصل ہے اور منکر اختیار کے خلاف اس کا اپنا حس ہی کھلی دلیل ہے
پتھر سے کوئی شخص نہیں کہتا کہ آ
ڈھیلے سے کون وفاداری چاہتا ہے (اس لیے کہ اس میں حس ہی نہیں ہے۔)

- آدمی را کس نگوید ہیں بپر
  یا بیا۔ اے کورخوش درمن نگر
- انسان سے کوئی نہیں کہتا ہاں اُڑ۔ اندھے شخص سے کوئی نہیں کہتا: آ مجھے غور سے دیکھ۔
  (اس لیے کہ ان میں اس کی حس ہی نہیں ہے۔)

- امر و نہی و خشم و تشریف و عقیب
  نیست جز مختار را اے پاک جیب
- حکم دینا، منع کرنا، غصہ کرنا، اعزاز دینا یا عتاب کرنا اے پاک دل یہ سب امور مختار ہی کے لیے ہیں۔

- این کہ فردا ایں کنم یا آن کنم
  این دلیل اختیار است اے صنم
- (یہ سوچنا کہ) آنے والے کل کے دن میں یہ کروں گا یا وہ کروں گا اے عزیز! یہ سوچ و فکر اور احساس خود اختیار کی دلیل ہے۔

- جملہ قرآن امر و نہی است و وعید
  امر کردن سنگ مرمر را کہ دید
- سارا کلام مجید امر و نہی اور وعید سے بھرا پڑا ہے سنگ مرمر کو حکم کرنا کہیں سنا اور دیکھا گیا ہے۔
  (مطلب یہ کہ قرآن کا مخاطب صاحبِ اختیار ہی ہے)

- ہیچ دانی ہیچ عاقل این کند
  با کلوخ و سنگ خشم و کین کند
- کیا کوئی سمجھ دار آدمی ڈھیلے اور پتھر سے غصہ اور کینہ رکھتا ہے۔؟

- استادان کودکاں را می زنند
  آن ادب سنگ سیہ را کے کنند
- اساتذہ اور معلمین طلبا کو مارتے اور پیٹتے ہیں کیا اس طرح کی تادیبی کارروائی پتھروں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

- ہیچ گوئی سنگ را فردا بیا
  ور نیائی من ترا بدہم سزا
- کیا تم پتھر سے یہ کہتے ہو کہ کل آ۔ اگر نہیں آیا تو تجھے میں سزا دوں گا؟

- خالقے کہ اختر و گردوں کند
  امر و نہی جاہلانہ چوں کند
- وہ خالق جس نے ستاروں اور آسمان کی تخلیق فرمائی۔ جاہلوں کی طرح کیسے حکم دے سکتا ہے اور کیسے منع کر سکتا ہے؟

مولانا جلال الدین رومی مذہبِ جبریہ کے ابطال میں رقم طراز ہیں:۔ ۵

- آن یکے بر رفت بالاے درخت
  می فشاند او میوہ را دزدانہ سخت
- ایک شخص درخت پر چڑھا اور چوروں کی طرح بہت سارے پھل توڑنے لگا۔

- صاحب باغ آمد و گفت اے دنی
  از خدا شرمیت گو چہ می کنی

- باغ کا مالک آ پہنچا اور اس سے کہنے لگا: اے کمینے! تو کیا کر رہا ہے۔ خدا سے تیرا ڈر اور شرم کہاں چلی گئی؟

- گفت از باغ خدا بندۂ خدا
  او میوہ را خورد کہ حق کردش عطا

- جواب دیا: خدا کے باغ سے خدا کا بندہ کچھ کھجوریں کھا رہا ہے، جو کہ اس کو خدا نے دی ہیں۔

- عامیانہ چہ ملامت می کنی
  بخل بر خوانِ خداوندِ غنی

- تو جاہلوں کی طرح یہ کیا ملامت کر رہا ہے؟ خداوند غنی کے دستر خوان پر یہ کیسی بخیلی اور کنجوسی؟

- گفت اے ایبک بیاور آن رسن
  تا بگویم من جواب بوالحسن!

- یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا کہ ایک رسی لاؤ، تاکہ میں اس مکار کو جواب دوں۔

- پس بہ بستش سخت آندم بر درخت!
  می زد او بر پشت و ساقش چوب سخت

- پھر اسی وقت اس نے اس کو درخت سے کس کر باندھ دیا اور ایک مضبوط لاٹھی لے کر اس کی کمر اور پنڈلی پر مارنا شروع کیا۔

- گفت آخر از خدا شرمے بدار
  می کشی ایں بے گنہ را زار زار

- اس نے چیخ کر کہا: خدا سے شرم کر۔ مجھ بے قصور کو کیوں بری طرح مار رہا ہے۔

- گفت این چوب خدا این بندہ اش
  می زند بر پشت دیگر بندہ خوش

- اس نے کہا: یہ خدا کی لاٹھی ہے۔ یہ اس کا بندہ دوسرے بندے کی پشت پر مار رہا ہے۔

- چوب حق و پشت و پہلو آن او
  من غلام و آلت فرمان او

- لاٹھی خدا کی، کمر اور پہلو بھی خدا کی ملک' میں اس کے تابع اور اس کے حکم کا غلام ہوں۔

- گفت توبہ کردم از جبری عیار
  اختیار است اختیار است اختیار است

- اس وقت کہنے لگا: اختیار ہے، اختیار ہے، اختیار ہے، میں جبری عیار سے توبہ کرتا ہوں۔

- چون تہ رنجور سر را بر مبند
  اختیار ہست بر سبلت مخند

- درآں کارے کہ میلستت بدان
  قدرت خود را ہمی بینی عیان
- جو کسی بھی کام کی طرف تمہارا میلان ہو تو تم کھلے طور پر اپنی قدرت کا معائنہ کر لیتے ہو (یعنی سمجھ جاتے ہو کہ میں قادر ہوں مختار ہوں۔)

- واندران کارے کہ میلت نیست خواست
  خویش را جبرے کنی کاین از خداست
- اور جس کام کی طرف تمہارا میلان نہیں ہوتا تو تم خود کو مجبور سمجھنے ہو اور کہتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

- ترک کن این جبر را کاین بس تہی ست
  تا بدانی سرِ سرِ جبر چیست
- اس قسم کے جبر کو ترک کر دو یہ حقیقت سے خالی ہے۔ تاکہ تم جبر کے راز کے راز کو بھی جان لو۔

جبر کا راز یہ ہے کہ افعال کا موجد اللہ تعالیٰ ہے لیکن جو فعل بندے کے اختیار سے صادر ہوتا ہے اور جو فعل بندے کے اختیار کے بغیر صادر ہوتا ہے۔ درحقیقت اس کے درمیان ایک فرق ہے۔ جیسا کہ مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس کی تفسیر کی ہے۔

- یک مثالی اے دل پئے فرق بیار
  تا بدانی جبر را از اختیار!
- اے دل! جبر و اختیار میں فرق کے لیے ایک مثال لے آو تاکہ تم جان لو جبر کیا ہے، اختیار کیا ہے!

- دست کو لرزاں بود از ارتعاش
  واں کہ دستے را بگر زانی زجاش
- ایک وہ ہاتھ ہے جو رعشہ کی وجہ سے لرز رہا ہو حرکت کر رہا ہو اور ایک وہ ہاتھ ہے جس کو تم حرکت دے کر اپنی جگہ سے ہٹاؤ۔

- ہر دو جنبش آفریدۂ حق شناس
  لیک نتواں کردایں با آں قیاس
- دونوں حرکتیں خدا کی پیدا کردہ سمجھو۔ لیکن تم رعشہ کی حرکت کو اختیاری حرکت پر قیاس نہیں کر سکتے۔

- زان پشیمانی کہ دادی لرزش اش
  خود پشیماں نیست مرد مرتعش
- ہاتھ کو تم نے خود حرکت دی ہے لہذا اس سے تم پشیمان ہو رعشہ والا پشیمان نہیں ہے۔

- بحث عقلی ایں چہ عقلِ حیلہ گر
  تا ضعیفی رہ برد آن جا مگر
- یہ عقلی بحث ہے اور عقلی بحث کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اس لیے کہ عقل حیلہ گر ہے

شاید وہ ضعف ہی کی حالت میں حقیقت تک پہنچے۔

- کرد حق و کرد خلق ہر دو ببین
  کرد ما را ہست و آن پیدا ببین

- خدا کا فعل اور ہمارا فعل دونوں دیکھ لو۔ ہمارا فعل نیست نہیں ہست ہے اور یہ بات ظاہر ہے۔

- گر نباشد فعل ما اندر میان
  پس مگو کس را چرا کردی چنان

- اگر درمیان میں ہمارے فعل ہی کا وجود نہ ہو تو پھر کسی بھی شخص کو یہ نہ کہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

- فعل حق افعال ما را موجد است
  فعل ما آثار فعل ایزد است

- ہمارے افعال کا خالق فعل حق ہے اور ہمارا فعل فعل خالق کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔

- زانکہ ناطق حرف بیند بے غرض
  کے شود یک دم محیط دو عرض

- اس لیے کہ معنے سے بے غرض ہو کر بولنے والے کی نظر صرف حرف پر ہوتی ہے۔ وہ بیک وقت حرف و معنی کا احاطہ کیوں کر سکتا ہے؟

- گر بمعنی رفت غافل شد ز حرف
  پیش و پس یک دم نہ بیند ہیچ طرف

- اگر معنی پر جائے تو حرف سے غافل ہو جائے گا اس لیے کہ کسی بھی طرف دیکھنے والا بیک وقت آگے اور پیچھے دیکھ نہیں سکتا۔

- مرد کامل ہر دو بیند در عیان
  او یقین داند نماند در گمان

- مرد کامل کی نظر کھلے طور پر حرف و معنی دونوں پر ہوتی ہے وہ یقین رکھتا ہے۔ شک میں مبتلا نہیں ہے۔

- اختیار آن اختیارش نیست کرد
  اختیارش چون سواری زیر گرد

- خدا کے اختیار نے بندے کے اختیار کو نیست کر رکھا ہے اور اس کا اختیار گرد و غبار میں پوشیدہ سواری کی طرح پوشیدہ ہے۔

- قدرتش بر اختیارات جہان
  نفی نکند اختیاری را از آن

- اصل جہان کے اختیارات پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ان اختیارات میں سے کسی بھی ایک اختیار کی نفی نہیں کرے گی۔

- خواستش می گوئی بروجہ کمال
کہ نباشد نسبت جبر وضلال

- تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ درجہ کمال پر ہے تو پھر جبر اور ضلال کی نسبت اللہ کی طرف کیوں نہیں کی جا سکتی۔

- چوں کہ گوئی فسق من خواہ وی است
خواہ خود را نیز ہم میدان کہ ہست

- تم کیوں کر کہہ سکتے ہو کہ میرا فسق وفجور میں مبتلا ہونا اللہ کے ارادے سے ہے۔ تمہارے اپنے ارادے کا بھی جائزہ لو کہ تم بھی ارادہ رکھتے ہو

- زانکہ بے خواہ تو ہم فسق تو نیست
فسق تا جبرش تناقض گفتنی است

- اس لیے کہ تمہارے ارادے کے بغیر تمہارا فسق بھی ممکن نہیں ہے تو فسق وجبر کو جمع کرنا قول بالتناقض ہے

حاصل کلام:

ہم مقلدین کو اس قسم کے مقدمات میں بحث وگفتگو کرنا ممنوع ہے۔ اور اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ خیر اور شر ہر دونوں اللہ تعالے کی جانب سے ہے۔ ہاں! اس مسئلہ کا حل فنا اور بقا پر موقوف ہے۔ قیل وقال میں میسر نہیں ہے۔ پھر خط وکتابت کے ذریعہ کیا حل ہو سکتا ہے۔ اللہ یشرح صدرکم ورفع قدرکم بحرمۃ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ••

مکتوب

حضرت قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ

حضرت قطب ویلور نے اپنے مکتوب میں امراء اور اغنیاء کی مذمت میں جو کچھ تحریر فرمایا اس کے تعلق سے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مکتوب نگار کے باب میں مکتوب الیہ کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور مکتوب نگار کی ساری توجہ صرف اپنے مخاطب کی جانب مرکوز رہتی ہے علاوہ ازیں اس کی نوکِ قلم سے صادر ہونے والی اکثر و بیشتر باتیں مکتوب الیہ کی ذات سے منسلک رہتی ہیں۔ اسی لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ حضرت قطب ویلور اپنے مخاطب کی اصلاح و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کے خیال سے امراء کی صحبت سے احتراز کرنے کی تاکید فرمارہے ہیں۔ کیونکہ مشائخ صوفیاء روحانی مریض کو بھی اس کے باطن اور قلب کے معائنہ و تشخیص اور اس کے احوال و کوائف کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف نسخے تجویز فرماتے ہیں۔

جہاں تک امراء و اغنیاء کی بات ہے اس کے تعلق سے مترجم کی رائے تو یہ ہے کہ جو امراء اور اغنیاء نیک کردار نیک سیرت کے مالک ہیں تو ان کی ذات موجب خیر و برکت ہوگی اور جو اغنیاء بد کردار اور بد سیرت ہیں تو ان کی ذات موجب نقصان و خسران ثابت ہوگی۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ امت کے دو گروہ (یعنی علماء اور امراء) میں نیکی اور تقویٰ ہے تو ساری امت نیکی اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہے گی اور اگر ان میں بدی اور برائی ہے تو ساری امت گمراہی اور ضلالت میں گھر جائے گی۔ جہاں جید علماء ربانی سے خیر کا ظہور اور علماء شیطانی سے شر کا ظہور، اور نیک طینت اغنیاء سے نیکی کا صدور اور بد طینت اغنیاء سے بدی کا صدور ایک اظہر من الشمس حقیقت ہے۔

لہذا امراء و اغنیاء کا وہی طبقہ مذمت کا مستحق اور گمراہی کا سبب ہوگا جس کا دامن فسق و فجور اور گناہ و عصیان سے داغ دار ہوگا اور مکتوب میں بیان کردہ احادیث اور تفصیلات کا مصداق بھی۔ اسی قسم کا طبقہ ہے اور اسی کی صحبت سے بچنے اور دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے ورنہ امراء کی صحبت سے متعلق خود حضرت قطب ویلور

نے اپنے بعض مکتوبات میں اپنے مریدین و خلفاء کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تم ارباب اقتدار اور اصحاب ثروت کی صحبت اس غرض اور مقصد کے تحت اختیار کرو کہ اپنے اثر و رسوخ اور صحبت و ہم نشینی کے ذریعہ انہیں دین کی جانب مائل اور اشاعت اسلام کی طرف راغب کر سکیں اور انھیں تقویٰ و طہارت سے آراستہ کر سکیں۔

مترجم ابوالنعمان بشیر الحق غفرلہ و لوالدیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام ہمشیرہ زادہ محمد قادر محی الدین مدراسی

حمد و صلوٰۃ اور تبلیغ دعوات کے بعد واضح ہو کہ مکتوب خیریت اسلوب چینی اور آہنی قفلوں اور کپڑوں اور کتاب عقائد نسفی کی خواہش اور طلب کے ساتھ دستیاب ہوا۔ نیز دوسرا مکتوب بھی موصول ہوا۔

نور چشمی امۃ الجمیل کے مزاج کی تندرستی کی خبر پہنچی الحمد للہ علی ذلک

عقائد کے درس و تدریس کے بارے میں اور فقہ پر عقائد کو مقدم کرنے کے بارے میں آپ نے جو اشارات کئے تھے پسندیدہ نظر آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے قلب میں بھی عمل پر عقیدہ مقدم ہونے کی بات راسخ ہو چکی ہے۔ برتن سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس کے اندر رہتی ہے۔

آں عزیز کو چاہیے کہ سب سے پہلے سنّت و جماعت کی کتب کلامیہ کے موافق عقائد کی تصحیح فرمائیں اور اس کے بعد فرض، واجب، سنّت، مندوب، حلال، حرام، مکروہ اور مشتبہ کو کتب فقہیہ کی موافقت پر درست خیال کریں۔ کیوں کہ یہ دونوں چیزیں (عقائد اور فقہ) عالم قدس کی پرواز کے لیے جناح کی منزل میں ہیں

آپ کی حسب خواہش کتاب عقائد نسفی ارسال کی جا چکی ہے۔ مل جائے گی۔ آپ نے دوسرے مکتوب میں نور چشمی کی صحت اور رفع جنون سے متعلق جو تحریر فرمایا تھا، قلب کو فرحت حاصل ہوئی شافی حقیقی صحت و عافیت سے ہم کنار رکھے۔

موسم سرما کے دنوں کی صحت و تندرستی کا چنداں اعتبار نہیں ہے۔ اگر موسم گرما کے دنوں میں بھی یہی صحت برقرار رہی تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ پوری طرح سے بے فکر بھی نہیں رہنا چاہیے اور پوری طرح ہمت و توجہ اسی پر مرکوز رکھنا چاہیے۔

کوئی شخص نور چشمی کو رنج و غم اور غصّہ میں مبتلا نہ کرے اور انھیں لذیذ میوے کھانے کے لیے دیتے رہیں۔

یہ کتنی بڑی دولت ہے کہ اور کتنی بڑی سعادت مندی ہے کہ انسان عالم شباب میں راہ حق پر گامزن رہے اور اسباب جمعیت کے حصول اور کثرت فراغت کے با وجود عنفوان شباب میں حق تعالیٰ کی جانب

مائل اور متوجہ رہے۔

یہی اصلی دولت ہے اب کس کے ہاتھ پہنچے گی میں خوف کھاتا ہوں کہ چرب و شیریں غذائیں اور منقش و رنگین کپڑے دنیاوی منصب وجاہ کی طلب اور اغنیاء اور امراء کے قرب کی خواہش کہیں اس راہ کے چلنے میں سستی نہ پیدا کردے۔

برے لوگ جن کا مقصد صرف حقیر دنیا ہے ان کی صحبت اور ہم نشینی آپ کی نیکی اور صالحیت کو ختم کرنے والی ہوگی اور آپ کی روحانی ترقی کو روک دے گی۔

دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ بدکردار امراء کو بری بلا خیال کریں۔ ان کی مال داری پر نظر کرتے ہوئے ان کی تعظیم کرنے اور ان لوگوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنے کو اہل اللہ نے گناہِ کبیرہ خیال کیا ہے۔ آپ اس بات سے ان کی صحبت اور اس کے اثرات سے متعلق قیاس کرلیجیے۔ کہ یہ چیز کس قدر نقصان دہ ہے۔ ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

حدیثِ شریف میں وارد ہے: جو شخص اغنیا کی مال داری کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ تواضع سے پیش آتا ہے تو وہ اپنے ایک تہائی دین و ایمان کو ضائع کرلیتا ہے۔ پس اس شخص کے لیے ہلاکت و تباہی ہے جو کسی آدمی کی مال داری کی وجہ سے اس کے ساتھ تواضع اور انکساری سے پیش آئے۔

دوسری حدیث میں ہے: علماء میں اشرار وہ ہیں جو امراء کے پاس جاتے ہیں اور علم کو پیٹ کے خاطر فروخت کردیتے ہیں۔

شیخ عطارؒ "تذکرۃ الاولیاء" میں لکھتے ہیں: امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ایک تونگر کو اس کے ایمان کی وجہ سے تواضع کی تھی اس کے بعد اس کے کفارہ میں ایک ہزار قرآن ختم کیا۔

شیخ ابوالمواہب جو بیداری کے عالم میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و دیدار سے مشرف ہوتے تھے ایک روز ایک محتاج کی سفارش کی خاطر ایک امیر کے پاس چلا گئے تو اس کے بعد خواب میں بھی زیارتِ نبویؐ کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا تو پھر بیداری کی زیارت کا کیا ذکر! کئی سال گریہ وزاری میں گزارنے کے بعد ایک مرتبہ دیدارِ نبویؐ سے مشرف ہوئے لیکن تین مرتبہ سلام کیا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جواب نہیں دے رہے ہیں اور چہرہ پھیر لیتے ہیں۔ چوتھی مرتبہ عرض کیا: یا رسول اللہ! میری کیا خطا ہے کہ مجھ سے چہرۂ مبارک پھیر لیے رہے ہیں۔ جواب دیا: جو شخص امراء کی صحبت میں رہتا ہے وہ ہماری صحبت کے لائق نہیں: اللّٰھم نجنا من حب الدنیا واھلھا: اے اللہ! دنیا اور اہل دنیا کی محبت سے نجات عطا فرما۔

٥

ہمہ اندر زمن بتو این است کہ تو طفبلی و خانہ رنگین است

اللہ محکم اینما کنتم : اللہ کی نصرت وحمایت تمہارے ساتھ رہے تم جہاں کہیں رہو۔ ۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام محمد ابراہیم مٹھدار

حمد وصلوٰۃ اور تبلیغ دعوات کے بعد واضح ہو کہ آپ کا مکتوب محبت اسلوب کتاب "نصیحۃ المسلمین" کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ وہاں کے باشندوں کی نااتفاقی اور فتنہ وفساد اور کتابِ مذکور کے مضامین کی صحت اور عدم صحت سے متعلق آپ کے استفسار کا علم ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگ مذکورہ کتاب کے مصنف مولوی خورم علی کو رافضی اور مشرک کہہ رہے ہیں نیز حامل مکتوب کی زبانی وہاں کے حالات اور کوائف سننے کا موقعہ ملا۔

میں نے کتابِ مذکورہ کا آخر تک مطالعہ کر لیا اور مطالعہ کی ابتدا ہی میں پتہ چل گیا کہ اس کا مصنف بزرگ سلیم اور اعتقادِ درست کا مالک ہے۔ اور اہلِ سنت وجماعت کے خطِ مستقیم پر گامزن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ کتاب شرک وبدعت کا قلع قمع کرنے میں بہت ہی خوب اور متین ہے اور اپنے نام کی طرح مسلمانوں اور مومنوں کے لیے سراپا نصیحت ہے۔ لہذا لوگوں کو چاہیے کہ دور از خیال قیل و قال اور بحث ومباحثہ سے الگ رہیں۔ اور اپنے معاش وروزگار کے حصول اور اس کی اصلاح اور پاکیزگی اور نماز وروزہ کی ادائیگی اور اپنی آخرت کے سنوارنے میں مصروف اور منہمک رہیں اور شرک و بدعات سے کنارہ کش اور مجتنب رہیں۔ فقیر شرک اور بدعت میں ظلمت وتاریکی کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھ رہا ہے۔

بھلے سے دنیا میں مشرک اور بدعتی کے عمل کو ضعفِ بصارت کی وجہ سے عمدہ اور بہتر دیکھیں اور سمجھیں لیکن آخرت میں جب کہ قوتِ بصارت ہوگی دیکھ لیں گے کہ بدعتی کا عمل خسران ونقصان اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دے گا۔ ؎

بوقت صبح شود روز معلوم است کہ با کہ باختہ عشق در شبِ دیجور

مدراس میں دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نام خورم علی، نثار علی اور قدرت علی ہے اور یہ اہلِ سنت وجماعت کے مذہب پر قائم ہیں اور معروف ومشہور ہیں۔ لہذا مومن کے لیے زیبا نہیں اور لائق نہیں کہ وہ کسی شخص کا نام خورم علی سن کر اس کے بارے میں سوئے ظن سے کام لیں۔ اور رافضی قرار دے دیں۔ ان بعض الظن اثم : بے شک بعض گمان گناہ ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر ملاحظہ ہو)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواھر الحقائق

نوادر الدقائق

قسط نمبر ۶

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

حمد تیری اے خدائے لم یزل
ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
نام تیرا اکسیر دل کی ہے دوا
ذکر تیرا روح کی میرے شفاء

جب زباں پہ محمد ﷺ کا نام آگیا
دوستو زندگی کا پیام آگیا
آپ کی مدح انسان کیا کر سکے؟
عرش سے جب درود و سلام آگیا

مترجم: ڈاکٹر حکیم سید لنسر پاشاہ قاسمی صبغۃ اللٰہی - شفاء ڈسپنسری گڈیاتم

ھر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیے جو ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے اور ہزاروں بار درود و سلام اس دربارِ گہربار، خلاصۂ کائنات فخرِ موجودات محسنِ اعظم، فخرِ آدم، سرورِ عالم، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کے طفیل و بدولت اسلام کا بول بالا ہوا اور کفر و شرک ضلالت و فسق کا منہ کالا ہوا۔

الحمد للہ کتاب "جواھر الحقائق" کے اس زیرِ نظر ترجمہ کی یہ چھٹی[۶] قسط ہے۔ اس کی پانچوں[۵] قسطیں فائدہ ۱، فائدہ ۲ اور فائدہ ۳ کے ترجمہ پر مشتمل تھیں اب اس چھٹی قسط میں فائدہ نمبر ۴ چار کا مکمل حصہ اور فائدہ نمبر ۵ پانچ کے کچھ اگلے حصہ کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

یہ ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اس کتاب کے اندر جو علوم و معارف اور رموز و حقائق ہیں، یہ ہر عام آدمی کی فہم و سمجھ سے باہر ہیں۔ اس سے صرف خواص بلکہ اخصّ خواص ہی فیض یاب ہوں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ چوں کہ یہ علمِ طریقت، علمِ معرفت و حقیقت کی ایک جامع کتاب ہے۔ جس کے اندر بحرِ ناپیدا کنار کی طرح بعض ایسے رموز و نکات ہیں جو سوائے عارفین و حقیقت بین، ہر عالمِ ظاہر بیں کے پلّے نہیں پڑ سکتے۔

خود صاحبِ کتاب "جواہر الحقائق" سلطان المشائخ مرشد الانام منبع الکشف والالہام، حافظ القرآن، حاجی الحرمین الشریفین محی الدین حضرت مولانا سید شاہ عبد اللطیف صاحب قادری نقوی ویلوری قدس سرّہٗ المتوفی ۱۲۸۹ھ نے اسے اپنے وقت کے بعض اہم مشاہیر صوفیائے عارفین کے شکوک و شبہات کے ازالہ کی خاطر ۱۲۷۳ھ میں تحریر فرمایا ہے اور اس میں علمائے ظاہر بین سے تخاطب نہیں فرمایا ہے:

زیرِ نظر کتاب "نوادر الدقائق" ترجمۂ "جواھر الحقائق" کی یہ چھٹویں قسط درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے:۔

۱ فائدہ نمبر چار (چار[۴])
۲ تعینِ حقیقی
۳ تشریح از مترجم
۴ تعینِ غیر حقیقی
۵ تنزلاتِ ستّہ علمیہ
۶ تشریح از مترجم
۷ تنزلاتِ ستّہ علمیہ اجمالیہ

کتبہٗ
حکیم سید افسر باشاہ قاسمی صبغۃ اللّٰہی۔
شفاء ڈسپنسری۔گڑیاتم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فائدہ نمبر ۴

اب چوتھا فائدہ دوسرے عنوان سے اسی مراتب سبعہ (سات مرتبے) کے بیان پر منحصر ہے۔

۲۔ تعیّن حقیقی :۔

جان لو کہ تعیّن یا تو حقیقی ہوتا ہے یا غیر حقیقی۔ پھر تعیّنِ حقیقی کو تعیّن ذاتی بھی کہتے ہیں کیوں کہ تعیّن ذاتی لازم ہے ذات کے لیے اور غیر متعیّن تو عدم ہے (نیست ہے) جیسے لا تعینِ علمی بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ علم کے ساتھ متعین نہیں ہوتا۔ مطلق طور پر بھی، اجمالی طور پر بھی۔ یا پھر تفصیلی حد تک بھی۔ اور ہر چیز سے خالص (اور الگ) ہونے کی بناء پر اسے واحدیّت الصِّرف بھی کہتے ہیں اور اسی طرح اس کو غیبِ[۲] ہویّت اور غیبِ[۳] الغیوب بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی ہر چیز فوق الغیوب ہوتی ہے اور ذاتِ بحت اور وجودِ مطلق بھی اسی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ظہور کے ساتھ مقید بھی نہیں ہے اور اس کے ساتھ تمام مظاہر کے ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کا نام مُظہِر بھی ہے۔

۳ تشریح از مترجم :۔

۱ یعنی چوتھا فائدہ مراتبِ سبعہ سے تعلق سے ہے۔ جسے حضرت قطبؒ ویلور نے یہاں ایک دوسرے انداز میں بیان فرمایا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ تعیّن کی دو[۲] قسمیں ہیں ایک حقیقی اور ذاتی اور دوسری قسم غیر حقیقی کی ہے۔

پھر تعیّن حقیقی کو دوسرے الفاظ میں ان ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے یعنے اس کے مندرجۂ ذیل نام بھی ہیں۔ (۱) واحدیّت الصِّرف۔ (۲) غیب ہویّت۔ (۳) غیب الغیوب۔ (۴) ذاتِ بحت۔ (۵) وجود مطلق۔ (۶) اور مُظہِر۔ غرض یہ چھے نام بھی جو درحقیقت تعیّن حقیقی ہی کے متفرق نام ہیں۔ (تشریح ختم۔)

۴۔ تعیّن غیر حقیقی :۔

اور تعیّن غیر حقیقی کو مظاہر اور مجالی بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ مُظہِر کے ظاہر ہونے میں باعتبار صورت اور محل واقع ہوتے ہیں اور تنزلاتِ ستّہ بھی اسی کا نام ہے۔ اگرچہ تعیّن غیر حقیقی یا تو تنزل علمی ہوتا ہے یا تنزل عینی۔

۵۔ تنزلاتِ ستّہ علمیہ :۔ پھر تنزلاتِ علمی کو تعیناتِ الٰہی اور تعینات وجوبی

بھی کہتے ہیں۔ اور انھیں (تعیّنات الٰہیہ اور وجوبیّہ) اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مُوجِد سے محتاجی نہیں رکھتے ہیں اور ان کا دوسرا نام مراتبِ عقلی اور مظاہرِ داخلی بھی ہے۔ کیوں کہ یہ حق لے آگے بھی ہیں اور حق سے منسوب بھی۔ غرض ان الگ الگ حقائق اور خالص عقلی دلائل کو غیبِ مطلق بھی کہتے ہیں۔

۶۔ تشریح از مترجم

اوپر چوتھے فائدہ میں حضرت قطبؒ ویلور قدس سرّہٗ نے مراتب سبعہ کی ایک الگ تحقیق پیش کرتے ہوئے تعیّن حقیقی کی بحث چھیڑی۔ اب تعیّن غیر حقیقی کی تعریف میں فرمایا کہ اس تعیّن غیر حقیقی کے بھی متفرق نام ہیں جو تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ گو الفاظ الگ الگ ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ تعیّن غیر حقیقی کو دوسرے الفاظ میں (۱) مظاہر (۲) مجالی اور (۳) تنزلات ستّہ بھی کہتے ہیں۔

پھر تنزلات ستّہ کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) ایک علمی (۲) دوسری عینی اور تنزلاتِ علمی کے پھر مزید چار نام ہیں: (۱) تعیّناتِ الٰہیہ (۲) تعیّنات وجوبیّہ (۳) مراتبِ عقلیہ (۴) مظاہر داخلیہ۔ پھر ان حقائق مجردہ اور دلائلِ عقلیہ کو غیبِ مطلق سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

تشریح ختم

۷۔ تنزلاتِ ستّہ علمیّہ اجمالیّہ

اب تنزلاتِ ستّہ علمیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک ۱ اجمالی اور دوسری ۲ تفصیلی۔ تنزلات ستّہ علمیہ ۱ اجمالیہ کو تعینِ اوّل اور "وحدت واحدیّۃ الجمع" بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے علمی اور عینی کثرت اتحاد کی وجہ سے اس کا نام وحدتِ واحدیۃ الجمع قرار پایا ہے اور یہ کثرت اتحاد علمیہ اور عینیّہ چوں کہ اجمالیہ ہیں۔ اور ان میں تفصیلی اتحاد نہیں ہے۔ اس لیے اس کو غیب اوّل بھی کہا جاتا ہے اور (اس کو غیب اول کہنے کی وجہ یہ ہے کہ) یہ غیب ثانی پر فوقیت رکھتا ہے۔

۸۔ تنزلاتِ ستّہ علمیہ تفصیلیّہ:

تنزلِ علمِ تفصیلی کا تعیّن ثانی اور الوہیت ۲ واحدیّۃ الکثرت ۳ بھی نام ہے۔ کیوں کہ اس وحدت میں کثرتِ علمی اور خارجی کا اتحاد بھی ہے۔ اور اس وحدت میں کثرت کی تفصیل بھی نہیں ہے۔ اور اس کو غیب ثانی بھی کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس میں اشیائے کونیہ (ہونے والی چیزیں) مخفی

اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے بھی اور اپنی مثل سے بھی۔

غرض ان دونوں تنزلات (علمیہ اجمالیہ اور تفصیلیہ) کی تجلیات (یعنے ان کا ظہور) ایک وجود (کی شکل میں) ظاہر ہوتی ہیں اور تقدم و تاخیر (آگے اور پیچھے ہونا) ان تین (مذکورہ) مراتب میں ذاتی اور عقلی ہے۔

۹۔ تشریح از مترجم

اور یہ جس طرح تنزلاتِ ستہ علمیہ اجمالیہ کی قسمیں اور نام میں مذکور ہوئیں اسی طرح یہاں تنزلاتِ ستہ تفصیلیہ کی بھی بحث کرتے ہوئے صاحبِ کتاب جواہر الحقائق حضرت شیخ قطبِ ویلور قدس سرہٗ نے اس کے بھی تین ناموں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ کہ تنزلِ علم تفصیلی کو (۱) تعینِ ثانی۔ (۲) الوہیت و احدیت الکثرت اور (۳) غیب ثانی سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ یہ اپنی ذات اور اپنی مثل سے بھی چھپا ہوا اور پوشیدہ ہوتا ہے

پھر اس نئی تحقیق مراتب سبعہ کے تحت جہاں پہلا مرتبہ تعینِ حقیقی کا ہے وہیں دوسرا مرتبہ تنزلِ علمیۂ اجمالیہ کا اور تیسرا مرتبہ تنزل علمیہ تفصیلیہ کا بھی ہے یہی تینوں مراتب مذکورہ تقدم و تاخر (کم و بیش) کے ساتھ ذاتی اور عقلی مراتب ہیں۔ (تشریح ختم)

۱۰۔ تنزلاتِ ستہ عینیہ

تنزلاتِ عینی چوں کہ اپنے موجد سے محتاجی رکھتے ہیں (اور انھیں اس کی حاجت رہتی ہے۔ اس لیے) انھیں تعیناتِ کونی[ع] اور تعیناتِ امکانی بھی کہتے ہیں۔ اور ویسے یہ حادث (نئے) ہوتے ہیں اور مخلوق سے منسوب بھی ہوتے ہیں اس لیے انھیں مراتبِ وجودی اور مظاہرِ خارجی سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اور عالم شہادت بھی اسی کا نام ہے۔ (اور گویا تنزلات عینی کے دوسرے الفاظ میں پانچ نام ہیں۔ (۱) تعیناتِ کونی (۲) تعیناتِ امکانی۔ (۳) مراتبِ وجودی۔ (۴) مظاہرِ خارجی اور (۵) عالمِ شہادت۔)

پھر تنزلاتِ عینی بھی یا تو اعیان مجردہ (تنہا اور خالص موجودہ حقائق جو دیکھنے) سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں یا پھر اس کی مادیت سے (اور یہ) اعیانِ مجردہ چوں کہ حق تعالیٰ کے حکم سے (کسی) مادہ کے واسطہ اور تعلق کے بغیر ہی اور کسی وقت کے (تعین کے) بغیر ہی موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں غیبِ مضاف سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھر اس غیبِ مضاف میں بھی جب کوئی غیبِ مطلق سے قریب تر ہوتا ہے 'بساطت و وسعت'

ع قولہ کونی: یہاں کون کے معنی ہونا، ہستی وجود اور دنیا کے ہیں۔ اس کی جمع اکوان ہے۔ مترجم عفی عنہ

(زیادتی اور بڑھوتری) بھی رکھتا ہے۔ اور مقدار و مساحت (کمیّت و پیمائش) اور حسّی اشارہ سے بھی پاک ہے تو ایسے غیب مضاف کو (۱) تنزلِ روحانی۔ (۲) عالمِ علوی۔ (۳) عالمِ امر۔ (۴) اور عالم ملکوت بھی کہتے ہیں۔

اور جو شہادتِ مطلق سے قریب تر ہو اور لطیف ترکیب بھی رکھتا ہو اور جسموں اور روحوں کے درمیان برزخی کیفیت کا حامل بھی ہو اور خالص نورانیت، بغیر کسی وسعت اور بڑھوتری کے اور بغیر جسم کے ایک حسّی مقدار و کمیّت (جو کسی قدر محسوس ہو سکتا ہو) اور جسمانی درازی سے درازی بھی ہو اور غیر ظاہری حواس سے اس کا ادراک و پہچان بھی ہو تو ایسے تنزل کو تنزلِ مثالی کہتے ہیں۔

اور وہ مادّی آنکھیں (اعیانِ مادّیہ) جو حکمِ الٰہی کے بعد مادّہ اور مدّت (وقت) کے ساتھ موجود ہوں اور (اپنے اندر) کثیف ترکیب اور کمیّت و پیمائش (مقدار و مساحت) رکھتے ہوں اور ان پر اشاراتِ حسّیہ (محسوس ہونے والے اشارات) کی راہ ہموار ہو اور وہ راہ پائی جاتی ہو (تو ایسی صورت میں اس کے نام صوفیائے کرام کے نزدیک) (۱) تنزلِ جسمانی۔ (۲) عالمِ سفلی۔ (۳) عالمِ خلق۔ (۴) عالمِ ملک ہوتے ہیں۔ نیز (۵) شہادتِ مطلق بھی اس کا ایک نام ہے۔ کیوں کہ یہ غیبِ مطلق کے مقابل (اور ضد میں) ہوتا ہے۔

غرض اس شہادتِ مطلق میں جو مفرد اجسام ہیں اور وہ بھی وجود کے دائرہ میں عرشِ الٰہی سے (حضرت) انسان تک پوشیدہ اور چھپے ہوئے ہیں۔ انھیں عالمِ اجسام کہا جاتا ہے اور جسمِ جامع کو انسانِ کامل کہتے ہیں (یعنی یہ جامع جسم جو شکل و صورت میں موجود ہے اسے کامل انسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

۱۱۔ تشریح از مترجم:

اوپر اعیانِ مجردہ اور اعیانِ مادیہ کی بحث چھڑی تھی، اس سے مراد انسان ہی ہے اور انسان خواہ مردہ ہو یا زندہ (احیاء ہو یا اموات) وہ اعیان ہی کہلاتا ہے۔ اور شریعت کے نزدیک جس طرح توسل بالاعمال جائز ہے اسی طرح توسل بالاعیان بھی جائز ہے۔

مثال کے طور پر توسل بالاعمال میں بخاری شریف کی حدیثِ غار سے استدلال ہے۔ جس میں تین آدمیوں نے اپنے اپنے اعمالِ خالصہ سے توسل کیا تھا۔ اور انھیں نجات ملی تھی۔ پھر توسل بالاعیان کے متعلق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کا وہ واقعہ ہے جس میں انھوں نے نمازِ استسقاء میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل کیا تھا۔

غرض اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر کوئی توسل بالاعیان بھی کرے تو توسل بالاعیان اور توسل بالاعمال میں آخر فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ خواہ وہ اعیان زندہ ہوں یا مردہ (احیاء ہوں یا اموات) کیوں کہ توسل بالاعیان

کا حاصل یہ ہوگا کہ :۔

"اے اللہ! یہ بزرگ زندہ یا مردہ آپ کے محبوب ہیں، اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے محبوب سے جس کو لگاؤ اور محبت ہوگی اس پر رحمت ہوتی ہے۔ ہم کو ان بزرگ سے عقیدت ہے، تلبّس ہے، لگاؤ اور محبت ہے لہٰذا ہم آپ کی اس وعدہ کی ہوی رحمت کے طلب گار ہیں "۔

تو فرمائیے اس توسل بالاعیان میں احیاء و اموات میں کیا فرق رہ گیا ہے۔؟ ظاہر بات ہے کہ جواب یہی ہوگا کہ یقیناً کچھ بھی فرق نہیں ہے یہاں تک تو اعیان کے تعلق سے تفصیل عرض کی تھی اب ....

حضرت قطب ویلورؒ نے اس چوتھے فائدہ میں مراتب سبعہ کی جو تفصیل پیش کی ہے اس کو نہایت اختصار کے ساتھ یہاں ہم سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان ساتوں مراتب میں سے پہلا مرتبہ تعینِ حقیقی کا ہے۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

پھر دوسرا مرتبہ تنزلات ستہ علمیہ اجمالیہ کا ہے۔

تیسرا تنزلات ستہ علمیہ تفصیلیہ کا مرتبہ ہے۔

چوتھا غیبِ مطلق سے قریب ترین مقام و مرتبہ رکھنے والا تنزل روحانی کا مرتبہ ہے۔

پانچواں شہادتِ مطلق سے زیادہ نزدیک مقام و مرتبہ رکھنے والا تنزل مثالی کا مرتبہ ہے۔

چھٹا وہ اجسام مفردہ ہیں جو دائرۃ الوجود میں عرش الٰہی سے انسان تک چھپے ہوئے مقام و مرتبہ رکھنے والے ہیں۔ اور یہ عالم اجسام کا مرتبہ ہے۔

ساتواں جسمِ جامع یعنے انسانِ کامل کا مرتبہ ہے۔ (تیسری تشریح ختم)

۱۲۔ تنزلاتِ ستہ عینیہ کی تفصیل دوسرے طریقے سے!

جب تنزلاتِ عینی تنہا تنہا واقع ہوں یا پھر مراتبِ کونیہ والٰہیہ جو ستائیس ۲۷ ہیں اکو ان مفردہ (مفرد ہستیوں) کے جامع ہوں اور جو وجود کے دائرہ میں عقلِ کُل سے انسان تک مرقوم اور لکھے ہوئے ہوں تو انھیں عالمِ اور انسانِ کبیر کہتے ہیں اور کونِ جامع (جامع ہستی) کے مرتبہ کو انسان اور عالمِ صغیر کہتے ہیں۔ گوکہ عالم تفصیل انسانِ کامل ہے۔ اور کامل انسان اجمالِ عالم ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

" ذاتِ مظہر کامل اور جامع ہوتی ہے، ذات اور صفات کے راز و نکات اسی مظہر سے روشن ہیں، اسی مظہر کے اندر یہ چمک دمک رہے ہیں۔ تمام نام ایک دوسرے کے رنگ سے موسوم ہیں "۔

(اوپر جو تعین اوّل کی بحث چھڑی تھی۔) اسی مثال پر ہستی کی تفصیل اب اجمال (مختصر طور پر) ہے

وجود کے اس دائرہ کی تُو اَب مکمل ہو چکی ہے۔ اس کا آخری نقطہ اب سب سے اوّل ہے۔ مُلّائے ظاہر بین یا لکھنے والا تو بس ظاہری نشانیوں کے جمع کرنے میں مصروف ہے، جب کہ اس کی ہستی انتہاؤں کی انتہا ہے۔

ان مفرد تنزلات کی تجلّیات ایک ایجاد ہے اور تنزلِ جامع کی تجلّی (دراصل) ایک کمال ہے اور تنزلِ جامع کا سفر اور سیر و سیاحت (سلوک کی راہ میں) مراتب کونیۂ الٰہیہ (یعنی ہستی اور وجود کے مراتب اور الٰہی مقام و مرتبہ) میں علمی حرکت کے سبب سے ہے نہ کہ اَینی (وجودی) حرکت سے۔ پھر ان آخری چاروں تنزلات میں تقدم و تاخر کے ساتھ (کم و بیش) زمانہ پایا جاتا ہے۔

غرض ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ انسانِ کامل گو کہ صورتاً ایک ہے (وحدت رکھتا ہے۔) لیکن (اس کے ساتھ ہی وہ) کثرت و وحدت کونیۂ الٰہیہ کا جامع بھی ہے یعنی کثرت اکوان (اپنے اندر مختلف ہستیوں، شکلوں اور رنگوں کی کثرت) اور جامع ہستی کی وحدت کا بھی نہ صرف جامع ہے بلکہ الوہیت کے (اعلیٰ مقام) و مرتبہ کی کثرت اور مرتبۂ وحدت کی وحدت کا بھی جامع ہے۔ مثال کے طور پر ایک تیار پختہ پھل کو دیکھو۔ گو کہ وہ صورتاً وحدت رکھتا ہے (یعنے ایک ہی ہے اور ایک سے زیادہ تو نہیں ہے۔ کیوں کہ ہاتھ میں ہم نے ایک ہی پھل لیا ہے اور اس کے سوا ہمارے ہاتھ میں کوئی اور پھل نہیں ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں اسے وحدت کہیں گے اور صورتاً یہ وحدت کے مقام اور مرتبہ پر فائز ہے۔) لیکن (جب اس میں غور کریں گے اور اس کی تہہ کو پہونچیں گے تو اندازہ ہوگا کہ وہ پھل ایک نہیں ہے بلکہ وہ کئی ایک طاقتوں، مرحلوں، مختلف شکلوں، قوتوں اور زمانوں کا جامع ہے۔ اور خلاصہ ہے۔) جامع کثرت اور وحدتِ شجر و ثمرِ اول ہے۔ (یہاں جھاڑ کی کثرت سے مراد اس کی جڑیں اور وہ شاخیں، ٹہنیاں، پھل، پھول اور کلیاں وغیرہ ہیں کہ ان سب صورتوں اور شکلوں، زمانوں اور مرحلوں سے گزر کر اس کا انتہائی خلاصہ اس کا پھل ہے اور وہ بھی پختہ پھل اور جو نیم پختہ اور کچّے ہوتے ہیں وہ نا مراد ہیں۔)

غرض درخت کی کثرت کے بعد اس کے خلاصہ کی شکل میں ایک پختہ پھل ہے جو جھاڑ کے آخری حصّہ اور سطح پر لگتا ہے اور یہ ذات کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن صفات کے اعتبار سے کثرت کا حامل ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے آخری ہے۔ (کہ شاخ کے آخری حصّوں اور کناروں پر واقع ہوتا ہے۔) اور آخرِ شجر ہے اور صفات کے اعتبار سے (خلاصہ کے طور پر) اوّلِ شجر ہے جو جامع بھی ہے سارے صفتوں کا۔

۱۳۔ انسانِ کامل:

اب اسی مثال سے سمجھو کہ انسانِ کامل وجود و ہستی کے آخری مقام و مرتبہ میں تخلیقِ عالم کا انتہائی اور آخری سبب ہے۔ جب درخت کے بونے (پیرنے) کی وجہ سے ایک پختہ پھل میسر ہوتا ہے (اور یہی اس کا اصلی سبب اور علت ہے۔ اس کے بغیر پھل میسر نہیں ہوتا، اسی طرح سمجھو کہ انسان بھی علت ہے

سبب ہے، ذریعہ ہے کمال کا۔) اگر انسان اپنے منتہائے سبب میں نہ ہوتا۔ (اور نکتۂ عروج کے آخری مقام پر نہ ہوتا۔) تو اس سے بھی کامل مقام و مرتبہ رکھنے والا کوئی دوسرا وجود عمل میں آتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا ہے۔ اور کسی وجود کا ظہور عمل میں نہیں آیا ہے تو معلوم ہوا کہ انسانِ کامل ہی مقصودِ جہاں ہے۔ اور تخلیقِ عالم کا خلاصہ اور منتہائے عروج ہے۔ (گویا انسانِ کامل ہی سبب ہے، ذریعہ ہے، علت ہے مقصود ہے تخلیقِ عالم اور تخلیقِ کائنات کا .... یعنے انسان کے لیے ہی یہ ساری کائنات اور اس کے ذرات و شش جہات ہیں۔)

۱۴۔ انسان کا پہلا اور دوسرا وجود: انسانِ کامل اور انسانِ ناقص:

اور اسی طرح غور کرو کہ (ایک) انسان (کامل) کا پہلا وجود و نشأۃ[ع۵] ایک انسانِ کامل بالفعل کے اعتبار سے کامل ہی ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ایک خام (اور کچے) پھل کی نشو و نما ایک پختہ پھل بالفعل کامل ہوتی ہے (بالقوۃ نہیں) بخلاف انسانِ ناقص کے کہ اس کو انسانِ حیوان کہتے ہیں: ؎

(شکل مردم ہے ولے مردم نہیں سب صفت حیوان کی پہ دُم نہیں۔)

(غرض یہ انسانِ ناقص یا انسانِ حیوان کا وجود) مفرد ہستیوں میں سے ایک مفرد (اور تنہا) ہستی ہے جامع ہستی (کونِ جامع) میں اس کا شمار و حصار نہیں ہے۔ اور اس کا وجود طفیلی ہے۔ منتہی اور ارادی نہیں ہے۔ (یعنی اس میں پختگی نہیں ہوتی ہے۔) ؎

این کہ می بینی خلافِ آدم اند نیستند آدم غلافِ آدم اند الخ

یعنے جن آدم زادوں کو تو دیکھ رہا ہے یہ درحقیقت خلافِ آدم ہیں۔ یہ آدم نہیں ہیں بلکہ آدم کی شکل و روپ میں آدم کا غلاف اوڑھے ہوئے خود کو انسان کہلاتے ہیں۔

ع۵ قولہ پہلا وجود الخ یہ انسانِ کامل و واصل حدیث شریف کے لحاظ سے "انّ اللہ خلق آدم علی صورتہٖ" (اللہ تعالیٰ آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) ایک پختہ پھل کی طرح صورت اور سیرت کے اعتبار سے ثمرِ اول جامع کثرت باللہ ہے اور کثرتِ شجر اور کثرتِ ثمر کے ظہور کی قابلیت بھی اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس کا عروج بکمال ہوتا ہے۔ اختفاء الکثرت فی الوحدت کا مقام و مرتبہ بھی رکھتا ہے اور اَنَا الحق (میں خدا ہوں۔) لا الٰہ الّا انا فاعبدونی (کوئی خدا نہیں سوائے میرے۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو۔) وغیرہا اس کی زبان سے اس مقام پر غلبۂ حال میں اس قسم کے جملے نکل جاتے ہیں جو کمالِ نشأۃ اولیٰ کے نتیجے میں واقع ہوتے ہیں۔ (یہ تو انسان کامل کی نشأۃ اولیٰ تھی۔) اب انسان مکمل و موصل (کی نشأۃ ثانیہ کے

اور یہ ناقص انسان ایک ایسا کچا (اور خام) پھل ہے جس کے کمالات نہ تو بالقوۃ ہوتے ہیں اور نہ بالفعل (یعنے جس کا کمال قوت کے اعتبار سے بھی نہیں، فعل کے اعتبار سے بھی نہیں ہے۔ گویا یہ ہاتھی کے دانت ہیں جو صرف دکھانے کے ہیں۔ مگر نہ کھانے کے ہیں نہ چبانے کے۔ اگر انسان (ناقص) اپنے اسی نقص کی حالت میں مرے اور وہ اپنے عنصری جسم کا پوست، گوشت چھوڑ دیتا ہے تو پھر وہ درجۂ کمال سے عاجز اور رُک جاتا ہے۔ جس طرح کہ ایک خام کچا پھل جب بغیر پوست اور چھلکے کے ہوتا ہے (اور ابھی اس کے اندر چھلکے کی نشو ونما نہیں ہو پاتی) تو وہ کمال و ترقی (کی راہ) سے رک جاتا ہے اور باز آجاتا ہے۔ (یعنے اس کے اندر ترقی اور نشو نما کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔) گلشن :

تبہ گردد[عـہ ۵] سراسر مغز بادام ‏ گرش از پوست بخراشی گہ خام

ولے چوں پختہ شد بے پوست نیکوست ‏ اگر مغزش براری بکفنی پوست

خلل در راہِ سالک نقص مغز است ‏ چو مغزش پختہ شد بے پوست نغز است

کچّے بادام کے بینچوں سے اگر ان کا مغز اور چار ولی (دال) نکال لی جائے تو وہ بیکار اور ضائع ہو جاتے ہیں (رکھنے اور استعمال کرنے کے قابل نہیں رہتے۔) ہاں جب کہ پختہ اور تیار ہو جائیں تو اب ان کو چھلکوں سے نکال کر رکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ بہتر ہے (اب یہ خراب اور ضائع ہونے کے اندیشہ سے بھی پاک ہیں۔ اب اسی مثال سے سمجھو کہ سالک کی راہ میں کچے اور خام بادام مخل اور مضر ہوتے ہیں۔ ہاں! جب یہ تیار اور پختہ بن جائیں تو اب ان کا یہ مغز سالک کے حق میں مفید اور بہتر اور قوت بخشنے والا ثابت ہوتا ہے۔

الحمد للہ! یہاں تک چوتھے[۴] فائدہ کا ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اب پانچویں[۵] فائدہ کا ترجمہ بعونہ تعالیٰ شروع ہو رہا ہے۔

(اگلے صفحے کا حاشیہ) تعلق سے سنئے کہ) وہ ایک پھل دار درخت کے مانند ہے جس میں بہت سے پختہ تیار پھلیں موجود ہوں اس کا عروج و نزول بھی کامل ہوتا ہے اور وہ اختفاءُ الوحدت فی الکثرت کے مقام و مرتبہ پر فائز رہتا ہے اور اس کی زبان سے اَنَا اللوحُ وَاَنَا القلمُ وَاَنَا العرشُ وَاَنَا الکرسیُّ وَاَنَا السبعُ السمٰوٰت وانا الارضون وَاَنَا سائرُ اجزاءِ الانسان الکبیر (میں ہی لوح ہوں، قلم ہوں، عرش ہوں، کرسی بھی میں ہی ہوں اور میں خود ہی ساتوں آسمان و زمین بھی ہوں اور انسانِ کبیر کے تمام اجزاء بھی میں ہی ہوں۔) جیسے الفاظ غلبۂ حال میں نکلنا — یہ اس کے کمالِ نشاۃ ثانیہ (دوسرے وجود) کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ اس مقدمے کی تفصیل اگر خدا نے چاہا تو کتاب "جواہر السلوک" میں دیکھا جائے۔ ۱۲ منہ رح

عـہ ۵ صاحبِ "منطق الطیر" ہندی (اردو) میں فرماتے ہیں کہ :

پوست ہے لک ڈھونڈ لے جا دوست کو ‏ موڑ چاول کو ہے پیدا پوست سو ۱۲ منہ رح

۱۵۔ فائدہ نمبر ۵

یہ پانچواں فائدہ بھی مراتب سبعہ کے بیان میں ہے۔ جو دوسرے انداز اور طریقہ سے بیان ہو رہا ہے۔ چناں چہ جو سمجھ میں نہ آئے اور دائرۂ سمجھ سے باہر ہو وہ احدیت صِرف، تعیّن ذاتی اور لاتعین علمی کہلاتا ہے اور اس کے عدم ظہور کی وجہ سے اسے باطن وجود بھی کہتے ہیں۔ (کیوں کہ یہ ظاہر میں نظر نہیں آتا ہے) اس کی باریکی، حقیقت، تہ اور اجزاء کو کوئی نہیں جانتا۔

۱۶۔ ذاتِ باری سمجھ سے باہر:

کتاب "الانسان الکامل" کے پہلے باب میں صاحب کتاب ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اور بالجملہ کمالات یعنی کمالاتِ ذات کے عدم انتہا (انتہا کا نہ ہونا) اور نفی ادراک (سمجھ میں نہ آنا) بھی ہے۔ پس یہ حکم لگایا گیا ہے کہ وہ ذات سمجھی نہیں جا سکتی۔ (سمجھ سے باہر ہے) اس لیے کہ وہ ذاتِ حق سے متعلق ہے اور وہ ایسی طاقت ہے (جس کے پیچھے لگنا گویا) ایک محال و مشکل معدوم کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرنے کے مترادف ہے۔" (الانسان الکامل ۲)

علامہ شعرانیؒ نے "موازین الدریّۃ" میں کہا ہے:-

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں و یحذّرکم اللّٰہ نفسہ: یعنے اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذاتِ عظیم الشان سے ڈراتے ہیں۔" اور اس سلسلہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات کی تحقیق میں تم سب ہی بے وقوف اور احمق ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ تفکروا فی آلاء اللہ ولا تفکروا فی ذاتہ: یعنی اللہ کی نشانیوں اور نعمتوں پر غور کرو اور سوچو لیکن اس کی ذات کے متعلق سوچا نہ کرو۔ و نیز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللہ قد احتجب عن العقول کما احتجب عن الابصار وان الملاء الاعلیٰ یطلبونہ کما تطلبونہ؛ (اللہ کی ذات جس طرح آنکھ سے نظر نہیں آتی اسی طرح عقل (فہم و ادراک) سے بھی پوشیدہ اور چھپی ہوئی ہے اور جس طرح ہم اللہ کی دیدار کے مشتاق ہیں؛ اسی طرح ملاءِ اعلیٰ (کے فرشتے) بھی اس کی دیدار کے مشتاق و طالب ہیں۔)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ حق کے سلسلہ میں گہرائی میں جانے اور غور و فکر کرنے سے روکا اسی لیے ہے کہ مخلوق اس کے اندر گھر جائے گی، بھٹک جائے گی۔ چناں چہ اس کی ذات کے بارے میں غور کرنے والے (صحیح) راستے سے گر گئے اور بھٹک گئے سو اُن میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں رہا جو

اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نشان دہی کی ہو اور اس پر کوئی حکم لگایا ہو۔ (اور حقیقت بتلائی ہو۔)

۱۷۔ امام غزالیؒ سے تسامح اور چوک:

اور حضرت شیخ اکبر محی الدین (ابن عربی) رضی اللہ عنہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہماری نگاہ میں (امام) غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ (اس مقام پر ان کے قدم پھسل گئے۔ یہی ایک ان کی بڑی غلطی ہوی۔) کہ انہوں نے اللہ کی ذات کے بارے میں کلام کیا، اپنی سمجھ بوجھ اور نظریئے سے۔ جب کہ یہ (محدود معلومات) اور نظریات اس کے اہل ہی نہیں ہیں اور اس قابل بھی نہیں ہیں (کہ ان کے ذریعہ سے ایک لامحدود اور لا ینحل بحرالسلوم، بحر ذخار اور ناپیدا کنار سمندر کی تہہ و بالا کو اپنی محدود معلومات سے سمجھایا جائے اور اسی نظریئے سے چکایا جائے کیوں کہ ایک طرف یہ ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے تو دوسری طرف اسی سمندر سے نکلا ہوا پانی کا ایک قطرہ بھی ہے۔ جو نسبت اس سمندر کو اس قطرہ سے ہے ٹھیک وہی نسبت ذات باری تعالیٰ کو ہماری ان محدود معلومات سے ہے۔ اور پھر یہ معلومات بھی دراصل درجۂ بخل میں ہیں۔) اس لیے امام غزالیؒ نے یہاں) ہر بات اور ہر دلیل میں غلطی کی ہے۔ صحیح اور معتدل راہ پر گامزن نہ رہ سکے۔ اور بعض صوفیوں سے ایسی مثالیں اور دلیلیں پیش کیں جو انتہا درجہ کی جہل و گمراہی سے وابستہ تھیں اور ذات الٰہی کی معلومات میں اپنی فہم و سمجھ کی ناواقفیت کی وجہ تاویلات بعیدہ (دور کے حیلوں بہانوں) سے کام لیا ہے۔ (جو یقیناً غلط راہ ہے۔)

۱۸۔ اپنی جہل اور لاعلمی کا اقرار:

ہاں اگر مان لو (اور ہتھیار ڈال دو کہ) وہ ذاتِ حق اور اس کی تمثیلات و معلومات (کما یلیق بشانہٖ) اس کی شایانِ شان ہیں اور تاویلات (وحیل۔ حیلے بہانے ڈھونڈنے) سے باز آجاؤ اور اپنے دلوں کے آئینہ کی روشنی پر عمل کرو تو پھر دیکھو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی صفات و معرفت کا ایسا علم عطا کریں گے جو دوسرا علم ہوگا۔ (یعنے علمِ لَدُنّی) اور وہ علم تمہارے دلوں میں اتر جائے گا پھر تو یہ مسئلۂ سوال بھی اسی کی ذات سے ہوگا اور شرح بھی اسی ذات باری تعالیٰ سے ہوگی۔ پس یہ لوگ اس کی ذات و حقیقت کو سمجھ جائیں گے کہ یہی وہ ذات باری تعالیٰ ہے (اور یہ نور بصیرت سے سمجھیں گے۔) اپنی (ان ظاہری) آنکھوں اور فہم و سمجھ سے نہیں۔

۱۹۔ تشریح از مترجم:

یعنے یہ لوگ اپنی ان ظاہری آنکھوں اور فہم و سمجھ سے ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کو نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ اپنے دل کے آئینے کی روشنی سے پہچانیں گے۔ جیساکہ حدیث شریف میں آتا ہے

"اتق فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللہ"۔ (مومن کی دانائی اور تیز فہمی سے ڈرکیوں کہ وہ نورالٰہی سے دیکھتا ہے۔ اپنی ان ظاہری آنکھوں سے نہیں۔) تشریح ختم۔

پس آج تک کسی نے بھی ذات باری تعالیٰ میں غور و فکر نہیں کیا ہے۔ سوائے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے۔

۲۰۔ مزید تشریح:

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے ذاتِ باری تعالیٰ میں سمجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ یہ ان کا مقام ہے۔ ان پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے، ان پر ملائکۃ اللہ کا ورود ہوتا ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ میں غور و خوض کرتے ہیں تو یہ ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے اور خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعۂ معراج ہے۔ تشریح ختم۔

بہرحال ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ (انسانِ کامل میں جتنے بھی ولی اور بزرگ آئے ہیں یا آئیں گے۔ وہ) اس ادب کے موقف سے واقف نہیں ہیں (یعنی وہ ذات باری تعالیٰ میں تفکر کے مجاز نہیں ہیں۔ انھیں تو صرف اللہ کی صفات و نشانیوں اور اس کی نعمتوں میں غور و خوض فکر و تدبر کرنے کی اجازت ہے۔ اور بس۔)

۲۱۔ اللہ کی ذات میں غور کرنے والے:

(غرض وہ حضرات جو اس کی ذات میں غور کرتے ہیں۔) یہ محض اپنی گمراہی اور جہالت سے اس میں غور و خوض کر رہے ہیں اور جہالت کی راہ میں پڑ گئے ہیں۔ چناں چہ ان میں کوئی کہتا ہے کہ وہ (ذات) جسم ہے اور کوئی جسم کا قائل نہیں ہے اور کوئی جوہر کا قائل ہے اور کوئی اس کا بھی قائل نہیں ہے۔ (یعنی وہ کہتا ہے کہ جوہر نہیں ہے۔) اور کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ وہ ذات ایک جہت ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اس کو جہت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(یاد رکھو کہ) ہمیں اللہ میاں نے یہ اس طرح کے انکار و اقرار (نفی و اثبات) کا حکم نہیں دیا ہے (لہٰذا یہیں سے یہ بات خوب واضح ہو گئی ہے کہ) انسان کی ذات کے اندر ہی پوری کی پوری جہالت بھری پڑی ہے" (اور وہ جہالت کا ایک مرکب مجسّمہ ہے۔ اور انہ کان ظلوما جھولا کا خطاب بھی اس پر خوب چپکتا ہے۔ اور صادق آتا ہے۔) انتہی

(موازین الدریۃ للشیخ شعرانیؒ)

۲۲۔ اللہ کی نشانیوں اور نعمتوں کو سوچو:

اور صاحبِ "فتوحات" اپنی کتاب کے ایک سو ستہترویں باب میں فرماتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے بارے میں غور وخوض کرنے سے ہمیں روکیں (اور سختی سے منع کریں۔) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے بعض (نا سمجھ) بندوں نے اس میں کلام کیا (اور بھٹک گئے۔) چناں چہ بعض ظاہر بین متکلمین اور فلاسفروں نے کلام کیا تو ان کے اپنے مقالات نے ذاتِ حق کی تحقیق وجستجو میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اور ہر ایک نے بھی اپنی وسعتِ نظر (اور بالغ نظری) کے تقاضے پہ گفتگو کی (یعنے اپنی وسعت معلومات کے تحت اٹکل پچو باتیں کیں۔) ایک فلسفی نے ان باتوں کا انکار کیا جنہیں دوسرے نے ثابت کیا تھا۔ (یعنے کسی نے انکار کیا اور کسی نے اقرار کیا پھر نتیجہ یہ نکلا کہ) یہ لوگ بالآخر اللہ کے اور اس کی ذات کے بارے میں اپنی اپنی نگاہ اور سمجھ بوجھ سے کسی ایک بات پہ بھی قائم نہ رہ سکے۔ (انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح نافرمانی کی۔)

۲۳۔ فلاسفروں کی باتیں:

غرض یہ فلاسفی اور متکلم حضرات کو اللہ نے محض اپنی رحمت اور شفقت کے تحت جن باتوں سے روکا تھا ان سے یہ باز نہیں آئے بلکہ اس میں گفتگو کی اور انہوں نے اللہ کی یہ عطا کی ہوی رحمت سے روگردانی کی۔ اور منہ پھیرا۔ (ضَلُّوا فَاَضَلُّوا کے تحت خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔) چناں چہ ان کی یہ کوشش دنیا و آخرت میں رائیگان و اکارت گئی، بیکار ہوی اور غارت ہوگئی۔ جب کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ (وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا)

ان لوگوں میں سے کسی نے کہا کہ وہ ذات علّت ہے اور دوسرے نے کہا کہ علّت نہیں ہے۔ پھر تیسرے نے کہا: ذاتِ حق کے لیئے جوہر، عرض اور جسم کا ہونا ٹھیک نہیں ہے بلکہ وہ عین انیت اور عینِ ماہیت ہے۔

جان لو کہ وہ ایسی ذات ہے جو (ان فلاسفی اور متکلمین) کے دنوں باتوں میں سے کسی ایک چیز میں بھی داخل نہیں ہوتی ہے۔ (بلکہ وہ ان سب چیزوں اور اقوال سے بری ہے اور ان لوگوں نے تو مخواہ اس معاملہ میں کھینچ تان کر لمبی چوڑی بحثیں کر ڈالیں اور لایعنی فضول بحث میں پڑ کر) اسے طول دے دیا۔ اور ان لوگوں کی ایسی حالت ہوگئی ہے جیسے مثل مشہور ہے کہ اَسْمَعُ جَعْجَعَةً وَلَا اَرٰى طَحْنًا (چکّی کے پسنے کی آواز تو سن رہا ہوں مگر آٹا نظر نہیں آتا ہے۔) (یعنے جس طرح محض چکّی کی آواز ہے اور آٹا نہیں ہے، اسی طرح ان لوگوں کی یہ فضول بکواس ہے اور حقیقت کچھ اور ہی ہے۔)

۲۴۔ شریعت عقل کے تابع نہیں بلکہ عقل شریعت کے تابع ہے۔

اب (دیکھو) ان لوگوں کی رائے اور عقل کے خلاف شریعت کیا کہتی ہے؟ وہ تو (صاف الفاظ میں) یہی کہتی ہے کہ جہاں اللہ کے آنے، نزول فرمانے، اترنے (عرش پر) بیٹھنے، خوش ہونے، ہنسنے، بولنے اور اللہ کے ہاتھ اور قدم ہونے والے الفاظ و روایات وغیرہ جو صحیح احادیث سے مروی ہیں اور جو حادث (نئے پیدا ہونے والے) صفات سے متصف بھی ہیں انہیں پیش کرتی ہے۔ وہیں ان حادث (اور پیدا ہونے والے) صفات کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی ہے کہ لیس کمثلہ شیئ یعنی اس ذات جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ (یہ محض مثال و تمثیلات ہیں اور بس) اور اگر (اس شرعی رائے کو) عقل کے تابع بنالیں اور بدل لیں اور جس طرح عقل کہتی ہے اسی طرح مان لیں اور عقل جس چیز پر دلالت کرتی ہے، اسی پر ڈھال لیں تو پھر ذات باری سبحانہٗ تعالیٰ پر اس کا اطلاق ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ایسی صورت میں صحیح احادیث کو جھٹلانا ہوگا۔ جب کہ اللہ تعالے نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ (دوسری قوم کی زبان میں نہیں۔) تاکہ وہ اپنی اس قوم کو صاف صاف وہ باتیں بتلائیں جو اُن پر اتاری گئی ہیں۔ اور وہ سمجھ بھی سکیں اور بے شک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خوب خوب وضاحت بھی فرمائی اور ان باتوں کو (اپنی امّت تک) پہنچایا بھی اور اس کے ساتھ ساتھ خود اللہ میاں کو اپنی امّت پر گواہ و شاہد بھی بنا دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امّت کو اس کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ (مگر ہم سے یہاں چوک ہوی اور اصل حقیقت کو نہیں سمجھا اور لیس کمثلہ شیئ یعنے نہیں ہے کوئی چیز اس کے مثل کی اصل کی سمجھ سے ہم غافل رہے اور کوتاہی کی۔)

پھر تو ہم نے اس تعلق اور نسبت کو جو لیس کمثلہ شیئ کے ساتھ خاص کر موجود ہے سمجھ نہیں سکے (اور اُلٹے) یہ آئے ہوئے الفاظ کی (ظاہری شکل و صورت کی) معقولیت میں الجھ گئے (یعنے اصل معانی پر غور کرنے کے بجائے ظاہری الفاظ کو سب کچھ سمجھ لیا اور اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کر لیا۔)

(یاد رکھو) ان ظاہری الفاظ کی اصل حقیقت ایک ہے۔ (البتہ) منسوب الیہ (جس کی طرف نسبت کی جاتی ہے) کے بدلنے سے الفاظ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مگر الفاظ کی جو حقیقت ہوتی ہے اس میں تبدیلی نہیں آتی کیوں کہ حقائق (یہ اپنی جگہ حقائق ہی ہوتے ہیں) یہ کبھی نہیں بدلتے۔

۲۵۔ تشریح از مترجم:

یہاں منسوب الیہ سے مُراد اللہ میاں کی ذات ہے۔ اور اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی رشتہ یا تعلق جوڑنا، یہی اس کی طرف نسبت کرنا ہے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالے ساتویں آسمان

سے، آسمانِ دنیا یعنے پہلے آسمان میں اترتے ہیں، تو اس اترنے کی نسبت کو نزول سے تعبیر کرنا یہی منسوب ہے اور نزول حادث ہے۔ نیا ہے، پیدا ہونے والا ہے۔ اور اللہ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے۔ وہ تو قدیم ہے۔ حادث نہیں ہے۔

اسی طرح حدیث قدسی میں آتا ہے کہ میں بندہ کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اٹھاتا ہے اور میں اس کا قدم بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے تو یہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ ایک طرح کی نسبت و تعلق ہے اور اس کے اندر بھی آنکھ، کان، ہاتھ، پیر سے تشبیہ دی گئی ہے جو سب کے سب حادث نئے اور ایجادی ہیں اور اللہ کی ذات موجود اور قدیم ہے اس کے وجود کو حدوث سے کوئی نسبت اور تعلق نہیں ہے۔

اور ایسے ہی تقرب الٰہی کے حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ حدیث بھی بہت بلیغ اور معنی خیز ہے جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ:-

"اللہ تعالیٰ امت سے پوچھیں گے: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی؟ (مرضتُ فلم تعدنی؟) آدمی کہے گا: یارب! آپ تو رب العالمین تھے میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ کہ کیا تمہیں علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار رہا مگر تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں؟ اگر تم اس کی عیادت کرتے تو مجھے اس کے پاس پاتے۔ اے ابنِ آدم! میں نے تم سے کھانا مانگا تو تم نے مجھے کھلایا نہیں۔ آدمی کہے گا کہ بارِ الٰہا! آپ تو دنیا کے پالن ہار تھے میں آپ کو کیسے کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تمہیں معلوم نہیں؟ کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا۔ مگر تم نے اسے کھانا نہیں دیا۔ اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے اس کے پاس پالیتے۔ اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی مانگا، مگر تم نے مجھے پانی نہیں دیا۔ آدمی کہے گا: خدایا آپ تو رب العالمین ہیں میں کیسے آپ کو پانی پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندے نے تم سے پانی مانگا مگر تم نے اسے پانی نہیں دیا۔ اگر تم اسے پانی پلاتے تو مجھے اس کے قریب پاتے۔" (صحیح مسلم شریف)

غرض اس حدیث میں اللہ کا بیمار رہنا، کھانا مانگنا، پانی مانگنا یہ سب اسی منسوب الیہ کی نسبت و تعلق سے مختلف الفاظ میں اور مختلف حالات میں وارد ہوئے ہیں۔ جو سب کے سب حادث، نئے اور ایجادی الفاظ ہیں۔ حالاں کہ اللہ کی ذات قدیم اور موجود ہے۔ حادث نہیں ہے۔ لیکن احادیث صحیحہ میں جو الفاظ آئے ہیں یہ مختلف ہونے اور حدوث سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی، ان کی حقیقت اور اصلیت

ایک ہی ہے ۔ اور انھیں عقل سے نہیں شریعت کی نگاہ سے دیکھنا اور سوچنا ہے ۔ جو یقیناً سبھی تشبیہات اور تمثیلات کی حدود میں محدود ہیں ۔ اور ان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور بس : (تشریح ختم)

(بہر حال ان ظاہری) الفاظ اور ان کے معانی کے اظہار و بیان کرنے میں جس نے سکوت اختیار کی اور خموشی لی اور ذاتِ حق کی طرف نسبت کرنے سے لاعلمی ظاہر کی (اور احتراز و پرہیز کیا تو سمجھو کر وہی اصل میں) عالم ہے اور مومن ہے ۔ (اور سچا مُوَحّد ہے ۔) اور جس نے ذاتِ حق کو ان ظاہری اور خارجی (تشکل صورت) سے جوڑ دیا تو (سمجھو کہ) وہ مومن بھی نہیں ہے ۔ اور عالم بھی نہیں ۔

۲۶۔ ظاہر بین فلاسفہ اور متکلمین :

(اور اگر ان ظاہر بین متکلموں نے) اپنے اس نظریئے میں انصاف سے کام لیا ہوتا (اور گہرائی میں جاتے) تو وہ یقیناً اللہ کی ذات میں غور وخوض نہ کرتے بلکہ اللہ میاں کی طرف سے جو کچھ بھی ہمیں ہدایت ملی ہے اسی پر (قناعت کرتے) اور ایمان لاتے ، جب کہ ایک سچی خبر دینے والے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی خبر دی اور اسی پر دلیل بھی پیش فرمائی ہے ۔

غرض ان معقولی فلاسفی (اور ظاہر بین دانش مندوں نے) اللہ کی ذات کے بارے میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان پر کلام کرنے سے میری زبان و قلم رکتے ہیں ۔ لہٰذا اس علم (ذات) کے بارے میں ہم نے عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے (عقل و فلسفہ سے نہیں بلکہ) نقل و روایت سے جو کچھ بھی ہمیں معلومات بہم پہنچی ہیں اور علم صحیح سے جو حقیقت واضح ہوی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی ذات کی طرف منسوب کرنے یا اس سے نسبت و تعلق جوڑنے میں جو مثالیں اور تشبیہات بیان کی گئی ہیں ان کا انکار کیا جائے ۔ کیوں کہ وہ ذات مجہولہ ہے (جس کا ادراک و افہام سمجھ سے باہر ہے ۔ ہاں سمجھنے اور سمجھانے ، افہام و تفہیم کے لیے جو مثالیں پیش کی گئیں ہیں یہ اپنی جگہ رہیں گی اور سمجھ میں آنے اور سمجھانے کی خاطر ہوں گی اور بس ۔)

(بہر حال اے پڑھنے والے اس کتاب کے) میں نے تجھے جن باتوں کی نصیحت کی ہے انھیں جان لے اور جو کچھ شریعت نے کہا ہے اس پر ثابت قدم رہ اور دل وجان سے قبول کر اور خوب (سمجھ لے کہ) یہی سب سے زیادہ جانی ہوی اور ربانی ہوی حقیقت ہے ۔ خود ہم نے بھی اس کی (اصل ذات کو) نہیں سمجھا مگر اتنا ہی جتنا کہ شریعت نے کہا ہے ۔

لا الٰہ الا ہو العزیز الحکیم سبحٰن ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العٰلمین یعنے کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جو لائق ہے حکمت والا ہے آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے ۔ انتہی : (الفتوحات)

الحمد للہ پانچویں فائدہ کا کچھ ابتدائی حصے کا ترجمہ ختم ہوا ۔ وللہ الحمد اولہ وآخرہ وظاہرہ و باطنہ وھو المستعان

/ جاری /

جواہر السلوک

تصنیف مجدد مجذوب حضرت العلام
شاہ محی الدین بنیرہ شاہ عبداللطیف قادری المعروف بہ
قطب ویلور

مترجم
ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی۔ سابق صدر
شعبۂ عربی فارسی اردو مدراس یونیورسٹی

سترھواں فائدہ

توحید کی قسمیں ہیں۔ قیصری[۱] قصیدۂ فارضیہ کی شرح کے مقدمہ میں توحید اور اس کے مراتب[۲] کے متعلق فرماتے ہیں: جان لو کہ بے شک توحید کے مراتب ہیں اور ان میں سے ادنیٰ مرتبہ یہ ہے لَا اِلٰہ اِلّا اللہ۔ اسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ یہ توحیدِ عوام ہے۔ توحیدِ خواص تین قسموں پر منقسم ہے:۔

اوّل: توحیدِ افعال، دوم: توحیدِ صفات، سوم: توحیدِ ذات

جس نے خدا کے سوا کسی دوسرے کو فاعلِ حقیقی سمجھا تو اس نے فعل میں اس کے ساتھ غیر کو شریک کیا۔

جس نے کسی صاحبِ صفاتِ کمالیہ کی صفات کو اس کی ذاتی صفات ثابت کیا تو اس نے خدا کی صفات و ذات میں شرک کیا۔ اس لیے توحیدِ افعال سے مراد تمام افعال کا مبدأ صرف ایک ذات کو سمجھنا ہے۔ اور وہ ذات حق ہے۔ انسان صرف مظہر ہے، جس سے فعلِ حق کا صدور ہوتا ہے[۴]۔ اس میں شک نہیں کہ مبدا افعال نفسِ ناطقہ اور اس کی صفات ہیں اور جوارح و اعضاء کے اختلاف سے فاعل کی وحدت میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔ اس لیے کہ تمام افعال جو اہلِ عالم سے صادر ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس کے ارادے سے ہیں۔ اس کے اسباب میں اختلاف اور اس کا استناد سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

---

۴ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

توحیدِ صفات سے مراد انسان کے صفاتِ کمالیہ کو صفاتِ الٰہیہ کی طرف منسوب کرنا ہے اور ان کو صفاتِ الٰہیہ میں مستہلک سمجھنا ہے۔ مثلاً انسانی علم علمِ الٰہی کا ایک چھینٹا ہے اور اسی طرح ارادت اور قدرت کے بحر کے قطرات کا ایک قطرہ ہے۔

توحیدِ ذات سے مراد تمام کونیہ ذوات کو ذاتِ احدیت سے منسوب اور اس میں مستہلک سمجھنا ہے۔

ان مراتبِ توحید کا علم یا تو بغیر مشاہدہ کے صرف استدلال سے حاصل ہوتا ہے یا مظاہر میں ربّ الارباب کے صفات و افعال کے مشاہدہ و معاینہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یا رسولوں اور اُن کے نائب علماء و اولیاء کی تقلید سے حاصل ہوتا ہے۔

توحیدِ استدلالی (استدلال کے ذریعہ خدا کی وحدانیت کو ثابت کرنا) انسان کو شکوک و شبہات سے پاک کر دیتا ہے۔ لیکن توحیدِ تقلیدی معرضِ زوال میں ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ صاحبِ تقلید توھّماتِ باطلہ سے ممکن ہے کہ دُور نہ ہو سکے۔ جب اُسے سُن کر یہ معلوم ہوا کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ واحد ہے تو وہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کی وحدت ایک شخصیت کی مانند ہے، خود اپنی شخصیت پر قیاس کر کے۔ اسی طرح جمیع صفات کا حال ہے۔ جب کہ اس نے حق کو حق سے نہیں جانا تو اس نے جو کچھ جانا وہ نہیں تھا سوا اس کے کہ ذاتِ حق اور اس کی صفات و افعال کو اپنی ذات و صفات و افعال پر قیاس کیا۔ بلکہ استدلال سے توحید کو ثابت کرنے والوں میں سے بھی کم ایسے ہیں جنہوں نے اپنے کو ان توہمات سے پاک کیا ہو۔ خصوصاً متفنیان اور علمائے ظاہر جو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے عالِم اور اس کی ذات و صفات و افعال کی معرفت سے کچھ حصّہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ مقلدین کی طرح توھّمات میں مبتلا ہیں۔ برخلاف ان لوگوں کے جن کا علمِ توحید شہودی ہے کیوں کہ ان کا شہود نورِ الٰہی کے ذریعہ ہے۔ جو اس کی اسماء و صفات اور اُن کے مظاہر میں جیسا کہ جاری ہیں۔ ان سے واقف ہیں۔ اور ان پر شبہ کا گزر نہیں ہوتا۔ اور اُن کے دل میں کوئی تنگ نہیں پیدا ہوتا۔ ان پر اوہام کا حکم نہیں چلتا اور ان کے دل کے آئینہ پر تاریکی کا زنگ اور میلا پن نہیں چڑھتا یہ حقیقت میں موحّدون ہیں اور رب کے یقینی عالِم ہیں۔ اس توحید کا کمال یہ ہے کہ یہ خود حق کی

صہ قیصری کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ توحید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک توحیدِ عوام دوسرے توحیدِ خواص۔ توحیدِ عوام تقلیدی ہے یا استدلالی اور توحیدِ خواص یا افعالی ہے یا صفاتی یا ذاتی۔ پس توحید کی کُل پانچ قسمیں ہوئیں۔

کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر انسانِ کامل و مکمّل کی طرف سے جمیع حقانی وجود کے مراتب کا مشاہدہ کرنے والا ہے، پھر وہ شخص جس کو اس کی نسبت تام اور قربت خاص حاصل ہو ان سے اکثر ان کے علم توحید سے کاملاً مستفید ہوتے ہیں۔ جن کو توحیدِ شہودی حاصل ہوتا ہے۔ اس توحید کے بعد توحیدِ استدلالی کا مرتبہ ہے۔ جو معقول اور منقول دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے بعد توحیدِ تقلیدی کا مرتبہ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

مَا وَحَّدَ الْوَاحِدُ مِنْ وَاحِدٍ	کسی نے حق کی توحید کا بیان اپنی فہم سے بتمام و کمال کیا ہے۔
اِذ کلّ مَنْ وَحّدَہٗ جاحدٗ	جس نے بھی توحید بیان کی اس نے حقیقت کے خلاف کہا۔
توحید مَن ینطقُ عن نعتہٖ	جو شخص حق سبحانہٗ کی توحید کی صفات کے بارے میں کہتا ہے
عاریۃٌ اَبطلھا الواحدُ	وہ محض دوسروں سے سُنی سنائی ہے جس حق رد کر دیتا ہے۔
توحیدہٗ ایّاہ توحیدہٗ	اس کی توحید وہی ہے جیسا کہ وہ ہے۔
و نعتُ من ینعتہ لاحدٗ	اور جو کوئی اسے بیان کرتا ہے وہ حقیقت سے پھرا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی وہ حقیقی توحید جیسا کہ حق ہے بیان نہیں کرتا۔

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ "نقد النصوص" میں صاحبِ ترجمۂ "عوارف المعارف" سے نقل کرتے ہیں کہ توحید کے مراتب ہیں۔ اول: توحیدِ ایمانی؛ دوم: توحیدِ علمی؛ سوم: توحیدِ حالی؛ چہارم: توحیدِ الٰہی۔

توحیدِ ایمانی وہ ہے کہ بندہ وصفِ الٰہیت کو فردیت کے ساتھ اور حق سبحانہٗ کے استحقاق معبودیت کو اس کی وحدت کے ساتھ قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ کے مطابق دل سے تصدیق کرے اور زبان سے اقرار کرے۔ یہ توحید مخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تصدیق اور ان کی باتوں کی سچائی پر اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ اس کا تعلق علمِ ظاہر سے ہے اور اس عقیدہ پر مضبوطی سے قائم رہنا بندہ کو شرکِ جلی سے چھٹکارا دیتا ہے۔ اور وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ متصوفہ بھی اس

توحید میں عام مسلمانوں کے ساتھ شریک ہیں۔ کیوں کہ ایمان کے لیے یہ عقیدہ رکھنا لازم ہے۔ لیکن صوفیہ توحید کے دوسرے مراتب سے بھی مخصوص ہیں۔ (جس میں عام مسلمان اس کے شریک نہیں۔)

توحیدِ علمی: اس علمِ باطن سے مراد ہے جسے علم الیقین کہتے ہیں۔ اور وہ اس طرح ہے کہ بندہ طریق تصوّف کی ابتداء میں یقین کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہے کہ موجودِ حقیقی اور موثّر مطلق صرف خداوندِ عالم جلّ جلالہٗ ہے اور جملہ ذوات، صفات و اقوال کو اسی کی ذات و صفات و افعال میں محو و ناچیز سمجھے۔ ہر ذات کو نورِ مطلق کا پرتو سمجھے۔ ہر ذات کو نورِ مطلق کا فروغ سمجھے۔ اور ہر صفت کو نورِ صفتِ مطلق کا پرتو سمجھے۔ یہاں تک جہاں بھی علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر[عہ] پائے اس کو علم الٰہی قدرت، سمع، بصر کے آثار کا ایک اثر سمجھے اور اس طرح تمام صفات و افعال میں سمجھے۔ یہ مرتبہ اہلِ خصوص و متصوفہ کے اوائلِ مراتبِ توحید میں سے ہے۔ اس کا مقدمہ توحیدِ ایمانی کے ساتھ پیوستہ ہے۔ یہ مرتبہ اس مرتبہ کے مشابہ ہے جس کو کوتاہ نظر توحیدِ علمی کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ توحیدِ علمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ توحیدِ رسمی (توحیدِ علمی عام) ہے جو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت و فطانت سے مطالعہ کے ذریعہ یا دوسروں سے سن کر توحید کے معنی کا تصوّر کرتا ہے۔ اور علمِ توحید کی صورت کا ایک خاکہ اس کے ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے اور اسی سبب سے وہ گاہ گاہ بحث و مناظرہ میں بے مغز باتیں کہتا ہے، لیکن توحید کی حالت کا کوئی اثر اس میں نہیں پایا جاتا۔

توحیدِ علمی اگرچہ توحیدِ حالی سے فروتر مرتبہ پہ ہے لیکن اس میں توحیدِ حالی کا کچھ امتزاج[*] ہوتا ہے اور اس کا مزاج تسنیم کی مانند ہے۔ جس سے مقربون[عہ] پیتے ہیں۔ یہ اس توحید کی شراب کا وصف ہے۔ اور اس سبب سے یہ صاحبِ توحید بیشتر ذوق و سرور میں ہوتا ہے اور توحیدِ حالی کے امتزاج کی تاثیر سے رسوم کی بعض تاریکیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ حتّٰی کہ بعض تصرّیحات

عہ بالجملہ ساری صفات اسی کی ہیں۔ وہ کلّیت اور اطلاق کی بلندی سے نزول کر کے جزویت اور تقیید کی پستی میں تجلّی کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ تاکہ تو جزو سے کُل کی طرف سفر کر لے اور تقیید سے اطلاق کی طرف آئے نہ کہ تو جزو کو کُل سے ممتاز جانے اور مقید ہی میں رہ جائے: لوائح جامی:

* یعنی یکتائیِ حق سبحانہٗ کا مفہوم جب اس کے دل پہ ہجوم ہوتا ہے تو ایسے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں وہ اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور اسباب کے وجود کو جو کہ الٰہی افعال کے روابط ہیں سے ہیں درمیان میں نہیں دیکھتا (یعنی اس کی نظر اسباب پہ نہیں بلکہ صرف مسبّب الاسباب پہ ہوتی ہے۔) لیکن اکثر احوال و اوقات میں وجود کی ظلمت کے باقی رہنے کے سبب اپنے علم کے اثرات اور تصرفات سے محروم رہتا ہے۔ اس توحیدِ علمی کے سبب بعض شرک خفی دُور ہو جاتے ہیں۔

توحیدِ حالی وہ ہے کہ توحید کا حال موحّد کی ذات کا لازمی وصف بن جاتا ہے اور وجود کے رسوم کی تمام تاریکیاں نورِ توحید کے غلبہ کے سبب مضمحل ہو جاتی ہیں سوائے اس کے کہ وجود کا کچھ شعور باقی رہتا ہے ورنہ نورِ علمِ توحید اس کے حال کے نور میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح مندرج رہتا ہے جیسے ستاروں کا نور آفتاب کے نور میں۔ ؎

فَلَمَّا اسْتَبَانَ الصُّبحِ اَدرَجَ ضَوْءَہٗ
بِاِسفَارِہٖ اَضْوَاءَ نُورِ الکَوَاکِبِ[عـه]

اس مقام پہ موحد کا وجود واحد کے جمال کے مشاہدہ میں اس طرح مستغرق ہو جاتا ہے کہ ذات و صفاتِ واحد کے سوا اس کی نظر کے شہود میں کچھ نہیں آتا۔ اس حد تک کہ اس توحید کو وہ واحد کی صفت دیکھتا ہے۔ نہ کہ اپنی صفت اور اس دیکھنے کو بھی وہ اسی کی صفت سمجھتا ہے اور اس کی ہستی اس طرح سے قطرہ کی طرح بحرِ توحید کے امواج کے تلاطم کے تصرف میں گر کر غرق جمع ہو جاتی ہے[عـه]۔ اسی لیے قولِ جنید قدس سرّہٗ ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اس میں رسوم و علوم مضمحل ہو جاتے ہیں اور بندہ اللہ کے لیے ہو جاتا ہے کہ اسے پھر کبھی زوال نہیں۔ ابن عطا کا قول ہے کہ توحید کی روح نسیان ہے اور توحید واحد کے جلال کے مشاہدہ میں ہے۔ حتّٰی کہ اس کا قیام بھی واحد کے ساتھ ہوتا ہے۔ توحید کے ساتھ نہیں۔ توحیدِ حالی کا منشاء نورِ مشاہدہ ہے اور

عـه صاحبِ توحید کا نہ اثر باقی رہتا ہے نہ علم۔ یعنی اس کی نظر سے ہر چیز مرتفع ہو جاتی ہے اور حق سبحانہٗ اس کو ایسا نظر آتا ہے جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب کچھ نہ تھا کان اللّٰہ ولم یکن معہ شیءٌ یعنی اس صرف خدا تھا جب کچھ بھی نہ تھا

عـه مزاجہ مِن تسنیم عیناً یشربُ بھا المقربون : تسنیم جنّت کے ایک چشمہ کا نام ہے یعنی ان کی شراب کی کیفیت وہی ہے جو مقربانِ تسنیم سے پیتے ہیں۔ یعنی صرف وہی پیتے ہیں اور ممزوج ابرار کو پلاتے ہیں۔ (حسینی)

توحیدِ علمی کا منشاء نورِ مراقبہ ہے۔ توحیدِ حالی سے بیشتر رسومِ بشریت فنا ہوجاتے ہیں۔ نورِ آفتاب کی مثال کہ اس کے ظہور کے غلبہ کے سبب زمین کے بیشتر اجزائے ظلمت دُور ہوجاتے ہیں، اور توحیدِ علمی سے بعض رسوم ظلمت دُور ہوتے ہیں، نورِ مہتاب کی طرح کہ اس کے ظہور سے زمین کے بعض اجزائے ظلمت دور ہوتے ہیں اور بیشتر ظلمات باقی رہتے ہیں۔ توحید حالی میں وجود کے بعض رسوم کے باقی رہنے کا سبب یہ ہے تاکہ ترتیب صدور افعال اور تہذیب اقوال موحّد سے ممکن ہوسکے۔ اور اس سبب سے حالتِ حیات میں توحید کا حق ادا کیا جاسکے۔ (یعنی احکام شریعت ادا کیا جاسکے۔) اسی لیے استاد ابو علی دقاق رح کا قول ہے کہ "التوحید غَرِیمٌ لا یُقضٰی دینُہٗ وَغریبٌ لا یُؤدّیٰ حقّہٗ"۔ اور اس توحید سے بیشتر شرک خفی دور ہوجاتے ہیں۔ خواص موحّدان کی زندگی میں حقیقتِ توحیدِ صرف کے سبب یکبارگی اس میں وجود کے آثار و رسوم مستہلک ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک لمحہ کے لیے ایک کوندنے والی بجلی کی طرح (یہ حقیقتِ توحیدِ صرف) روشن ہوتی ہے اور فوراً منطفی ہوجاتی ہے۔ اور بقایائے رسوم اس کے بعد پھر معاودت کرتے ہیں اور اس حال میں بقایائے شرکِ خفی بطور کلّی مرتفع ہوجاتے ہیں۔ اس مرتبہ کے اوپر آدمی کے لیے توحید کا کوئی مرتبہ ممکن نہیں ہے۔

توحیدِ الٰہی یہ ہے کہ حق سبحانہٗ ازل الازل سے خود اپنی ذات سے نہ کہ دوسروں کی توحید سے وحدانیت کے وصف اور فردانیت کی خصوصیت سے موصوف و مخصوص ہے: کان اللہ ولم یکن تسیئٌ معہ (یعنی جب صرف خدا تھا اور کوئی چیز نہ تھی۔) اور اب بھی وہ اسی طرح لمت ازلی سے واحد و فرد ہے۔ الآن کما کان (اب وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ تھا) اور ابد تک (یعنی ہمیشہ کے لیے۔) وہ اسی وصف سے موصوف رہے گا۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ (سوائے اس کے وجہ کے ہر چیز ہالک ہے۔) یہاں یُھلک نہیں کہا گیا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ تمام اشیاء کا وجود اس کے وجود میں آج بھی ہالک ہے۔ محجوبان کو اس حالت کا مشاہدہ کل قیامت میں ہوگا۔ لیکن اربابِ بصیرت اور اصحابِ مشاہدہ جو کہ زمان و مکان کی تنگنائے سے خلاصی پاچکے ہیں یہ وعدہ ان کے

غنہٗ توحید اس قرض خواہ کی مانند ہے جس کا قرض نہ ادا کیا جاسکے اور وہ مسافر ہے جس کا حق نہ ادا کیا جاسکے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ہستی مرکب ہے اور حق سبحانہٗ بسیطِ حقیقی کہ جو کثرتِ ذہنی و خارجی کو سلب کرلیتی ہے اور مرکب ذوق کے ذریعہ بسیط کا ادراک نہیں کرسکتا۔

حق میں آج بھی نقد ہے۔ آج وہ اُن سے دُور ہے اور ہم سے قریب ہے فردانیت کی عزت اور وحدانیت نے غیر کو مجالِ قرب نہ دیا۔ یہ حق توحید اور یہ توحید ہے۔ جو وصمتِ نقصان سے بَری ہے اور ملائکہ اور آدمی کی توحید وجود کے نقصان کے سبب ناقص ہے۔ شیخ ابواسماعیل عبداللہ انصاری نے اسی معنی میں کہا ہے۔ ؎

ماوحّد الواحد من واحدٍ	اذکلّ من وحّدہ جاھدُ
توحید من ینطق عن نعتہٖ	عاریۃٌ ابطلھا الواحدُ
توحیدہ ایّاہ توحیدہ	ونعت من ینعتہ لاحدُ

شیخ کمال الدین عبدالرزاق کاشی شرحِ منازل السائرین میں ان اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں: کہ کسی نے حق سبحانہٗ کی توحید اس طرح نہیں بیان کی جیسا کہ اس کا حق ہے۔ جس نے بھی خدا کی وحدت کا بیان کیا اس نے خود اپنے فعل اور اسم کو اس کی توحید میں ثابت کیا۔ تو اس نے غیر کے اثبات میں کوشش کی۔ توحید اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ رسوم و آثار اس میں فنا نہ ہو جائیں۔ جب حضرت احدیت کا بیان نہیں ہو سکتا جس میں نہ زبان کی گنجائش ہے نہ رسم و اسم کی۔ نطق و نعت رسم کے متقاضی ہیں اور ہر وہ چیز جس سے وجود کی بو آئے تو وہ حق کے لیے عاریتاً ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس کو اس کے مالک کی طرف لوٹا دے تاکہ توحید صحیح ہو اور حق واحد باقی رہے اس لیے واحد حقیقی نے اس عاریتی توحید کو رد کر دیے جو اسمِ غیر کے ساتھ ہو اس لیے ایسی توحید حضرتِ احدیت کے نزدیک مخالف و باطل ہے۔ توحیدِ حق خود اس کی ذات میں ہے اور وہی توحیدِ حقیقی ہے اور جس نے اس کا وصف بیان کیا وہ اہلِ طریق سے ہٹا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس نے صرف نعت کو ثابت کیا اور حضرتِ احدیت کو نہیں۔

ان ابیات کے حل میں ملّا عبدالغفور حاشیۂ نفحات میں لکھتے ہیں:

جس کا حاصل سخن یہ ہے: ۔ کہ

توحیدِ حقیقی اس وقت وجود اختیار کر سکتی ہے جب کہ حق سبحانہٗ جو کہ بسیطِ حقیقی ہے بے مزاحمت انسان کے ادراک میں آجائے اور یہ معنی صرف ذاتِ حق سے وجود پذیر ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ ترکیب سے خالی ہے اور انسان مرکب اور مرکب غیر مرکب کا احاطہ نہیں کر سکتا بطریق ذوق۔ اس لیے اگر کوئی دعویٰ کرے کہ وہ توحیدِ حقیقی کا بیان کرتا ہے تو اس کا حال اس کے قال کی تکذیب کرنے والا ہے۔

جب حاصلِ سخن معلوم ہوگیا کو اب میں حل ابیات کا آغاز کرتا ہوں :۔
پہلا شعر : توحیدِ حقیقی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں توحید کے چاروں اقسام داخل ہیں ۔
دوسرا شعر : توحیدِ حالی کے ماسوا توحید کی قسموں کی نفی کرتا ہے :
تیسرا شعر : توحیدِ حالی کی نفی کرتا ہے ۔

پس آخری شعر پہلے شعر کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ یعنی ما وحّد الواجد .... الخ
اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے توحیدِ حقیقی کا بیان نہیں کیا، کیوں کہ جو بھی حق کی توحید بیان کرتا ہے وہ یا تو توحیدِ ایمانی ہے یا علمی ہے یا رسمی ہے ۔ وہ عین توحید میں کثرت کا اثبات کرتا ہے جو عبارت ہے توحید کی نسبت سے اور طرفین سے یعنی موحِّد اور موحَّد ۔ اور اگر توحیدِ حالی بیان کرتا ہے تو اس کا بھی مُدرَک و مشہود صرف ایک نہیں ہوتا کیوں کہ اس صورت میں بھی بسیط اضافی ہوتا ہے۔ (یعنی بسیط موحِّد کی نسبت سے ہوتا ہے۔ یعنی حق جیسا ہے ویسا ۔ بیان میں نہیں آتا بلکہ موحِّد کے حال کے مطابق بیان ہوتا ہے۔) کیوں کہ مرکب بسیط کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ اس لیے اس کا سارا بیان توحیدِ حقیقی سے فاقد رہتا ہے۔ اور چوں کہ اس کا بیان توحیدِ حقیقی سے فاقد ہے اس لیے اس کا حال اس کے دعوی کی تکذیب کرتا ہے ۔ اگرچہ وہ اپنی زبان سے مدّعی ہے لیکن اس کا حال اس کی زبان کا منکر ہے۔

بیتِ ثانی توحید من ینطق .... الخ یعنی وہ شخص جو واحد حق سبحانہٗ کی توصیف بیان کرتا ہے اور ذاتِ واحد کی وحدانیت سے موصوف کرتا ہے جو کہ توحید حالی کے سوا ہے وہ بھی توحید صورتی اور عاریتی ہے نہ کہ حقیقی ۔کیوں کہ حقِ واحد اس توحید کا بطلان کرتا ہے کہ دلِ غیرِ حق سے یکتا ہوگیا ہے وہ حق سے ہٹا ہوا ہے اور وہ توحیدِ حقیقی سے منحرف ہے کیوں کہ توحید سے جو بھی مُدرَک و مشہود ہے وہ بسیطِ اضافی ہے (یعنی موحِّد اور موحَّد کی نسبت سے ہے۔) نہ کہ حقیقی ۔ اس لیے وہ وحدتِ حق جو بسیطِ حقیقی ہے اس کے موافق نہیں ہے ۔ اور حقیقت سے منحرف ہے ۔ واللہ اعلم ۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ توحیدِ حالی میں عین و اثر زائل نہیں ہوتا بلکہ شرکِ خفی سے بیشتر زائل ہوجاتا ہے ۔ لیکن خواص موحّدان پر زندگی ہی میں حقیقتِ توحید صرف کبھی کبھی ایک لمحہ کے لیے ایک کوندتی ہوی بجلی کی طرح روشن ہوتی ہے اور فوراً زائل ہوجاتی ہے اور یکبارگی عین و اثر زائل ہوجاتے ہیں اور ایسا بار بار ہوتا ہے ۔ اس وقت بقایا لے شرک کلیتہً

مرتفع ہو جاتے ہیں۔ اس مرتبہ کے اوپر آدمی کے لیے توحید کا کوئی اور مرتبہ ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی لیے شیخ علاء الدولہ سمنانی فرماتے ہیں:۔

آں وہم بود کز تو دوئی برخیزد — یہ وہم ہے کہ تم سے دوئی کلیتہً ختم ہو جائے
امکانِ وحدت بره روی برخیزد — یہ بھی وہم کہ سالک جو ممکن الوجود ہے اس سے امکان و حدت زائل ہو جائے۔

گر لطفِ خدا در رسد از راہِ کرم — اگر خدا کا لطف و کرم شاملِ حال ہو جائے
شاید کہ دمی از تو توئی برخیزد — تو یہ ممکن ہے کہ ایک لمحہ کے لیے تجھ سے خودی کا احساس ختم ہو جائے۔

شیخ محب اللہ[۱۳] اللہ آبادی فصوص الحکم کی شرح میں کہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ تجلّیِ ذاتی موجب فنا ہے اور دوئی کو زائل کرنے والی ہے۔ وہ دوسری تجلّی ہے جس کو تجلّیِ قہری کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سوال فرماتا ہے کہ لمن الملك اليوم (آج کس کا اقتدار کلّی ہے؟) اور اس کے جواب میں وہ خود فرماتا ہے: لِلّٰہِ الواحد القھار (اللہ واحد قہار کے لیے ہے۔) اور پھر فرماتا ہے: من معنا یَسمعُ ھٰذا السّوال الیوم؟ (کون ہے میرے ساتھ جو اس سوال کو سنتا ہے؟) پھر جواب میں فرماتا ہے: لا بل فی کلِ یومٍ لا بل فی کلِّ آن (نہیں بلکہ کسی دن نہیں بلکہ کوئی لمحہ نہیں:)

جاننا چاہیے کہ یہ تجلّی برقِ قہری اکثر ہوتی ہے (یعنی دوامی نہیں ہوتی۔) ورنہ کبھی عین واثر تجلّیِ قہری کے لمحہ سے زیادہ عرصہ تک بلکہ دواماً زائل ہو جائے۔ چناں چہ قیصری مقدمہ شرحِ فارضیہ مقصد ثالث کے فصل اول میں لکھتے ہیں:۔

"اس وقت سالک کی نظر میں حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا تو جب اس نے دیکھا تو گویا حق نے دیکھا۔ ناظر کی صورت میں اور جب اس نے کچھ سنا تو گویا حق نے سنا۔ اس کا کلام قائل کی صورت میں جو اس نے اپنی ظاہری زبان سے کہا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے بندے کی زبان سے کہا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہ"

اور یہ قرب نوافل کے نتیجے کی طرف اشارہ ہے کہ جب میں بندے سے محبت کرتا ہوں تو اس کے سننے، دیکھنے، بولنے، چلنے، کرنے کی قوت بن جاتا ہوں۔ (حدیث) اور اللہ تعالیٰ نے کہا: وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمیت ولکنّ اللہ رمیٰ۔ یہاں بندے کا وجود ساقط

ہوجاتا ہے اگرچہ نفس الامر میں اس کا وجود متحقق ہے اور یہ نصوص اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں (یعنی بندے کے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں) لیکن بندہ اپنے وجود کو نورِ حق میں مغلوب پاتا ہے۔ تو سوائے حقانی وجود کے وہ کچھ نہیں دیکھتا تو اس کے نزدیک ربِّ واحد کے سوا کچھ نہیں باقی رہتا۔ اگر اس وقت وہ انوارِ الٰہیہ قاہرہ سے مجذوب ہوگیا جس سے عقل و اوہام باقی نہیں رہتے۔ اگر جمالِ حق میں یہ انجذاب دائمی ہے تو اس کا انجذاب بھی دائمی ہوگا۔ اگر دائمی نہیں ہے تو وہ اتنی مدّت کے لیے عقل و ہوش سے عاری ہوگا۔ جتنی مدّت کے لیے یہ انجذاب ہوگا اور اس مدّت میں تکلیف شرعیہ اس سے ساقط ہو جائے گی۔ صوم و صلوٰۃ وغیرہ[*] اور اگر وہ مجذوب نہیں ہوا اور وہ اشیاء میں عقل سے تمیز کرسکتا ہے تو اگر لطفِ الٰہی اس کے شامل حال ہوا اور اس کو زندقہ، اباحت اور خود اپنی طبیعت کے حکم پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا۔ لیکن ساتھ ہی اس سے تکالیفِ شرعیہ کا ظہور نہ ہوا اس سبب سے کہ وہ حق کے مشاہدہ میں غرق ہے تو وہ مقام تمکین میں ہے اور وہ جمع کے بعد مقام فرق[۱۳] میں ہے تو وہ حق کا مشاہدہ کرتا ہے اور خلق کا بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں اس کو محجوب نہیں کرتیں یعنی وحدت کا مشاہدہ کثرت میں اور کثرت کا مشاہدہ وحدت میں کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عین کے بقا کا حال بعد فنا و افعالی و صفاتی و ذاتی اور چیز ہے اور عین فنا کا حال ان تینوں کے فنا کے بعد اس سے مختلف چیز ہے۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ ابن عربی فص شیثیہ میں فرماتے ہیں کہ ذاتی تجلّی کبھی ظاہر نہیں ہوتی، مگر جس پہ تجلّی ہو اس کی استعداد[۴۵] کی صورت کے مطابق اور اس کے سوا کبھی نہیں ہوتی کیوں کہ سالک آئینۂ حق میں اپنی ہی صورت کو دیکھتا ہے اور حق کو نہیں دیکھتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ حق کو اپنے علم کے ساتھ دیکھے۔ کیوں کہ وہ اپنی ہی صورت کو اس میں دیکھ سکتا ہے۔

---

[*] جس سے تکلیفِ شرعیہ منقطع ہو جائے اس کو صاحبِ جمع مکسّر کہتے ہیں اور غیر منقطع کہ یعنی جو نماز، روزہ وغیرہ کے وقت باشعور ہو جائے اور اسے ادا کرلے اُسے صاحبِ جمع سلامت کہتے ہیں۔

[۴۵] اس استعداد سے مراد متجلّی لہٗ کی اس جزوی استعداد سے ہے جو نفس کو اس کی خواہشات اور کدورتوں سے پاک کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے ورنہ اس امر میں اشتباہ ہوگا کہ واقعی کسی شخص پر تجلّی ربانی کا ظہور ہوا ہے اور اگر تزکیہ نفس کے بغیر کوئی مدعی ہے تو ایسے مدعی فرعون کی طرح ہیں (بقیہ اگلے صفحے پر)

شیخ محب اللہ الہ آبادی، "شرح فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں کہ ذات الٰہی کی کوئی صورت متعین نہیں ہے۔ یہاں سے تم سنتے ہو کہ پانی کا رنگ اس کے برتن کے رنگ کے مطابق ہوتا ہے[۶۵]۔ اس کی ذات اعیان کا آئینہ ہے۔ اس میں سر و پا نہیں۔ اس میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ بندہ کی صورت ہے جو خود اس کی استعداد کے مطابق ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اعیان حق کا آئینہ ہیں حق تعالیٰ کے احکام کے ظہور میں کہ آئینہ کے مطابق اس کے صغیر و کبیر[۱۴] میں اسماء اور احکامِ اسماء ظاہر ہوئے ہیں۔

ساتویں اور پندرھویں فائدے میں ذکر کیا گیا کہ انسان سے فقط وحدت تک قوسِ عروجی میں سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ میں حق سالک کا آئینہ ہوتا ہے اور نزولِ قوس میں نقطۂ وحدت سے انسان تک سیر باللہ اور سیر عن اللہ میں سالک حق کا آئینہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آئینہ محجوب ہوتا ہے۔ پس آئینہ حق میں سالک اپنی ہی صورت کا مشاہدہ کرتا ہے اور شیخ کا یہ قول کہ تجلّی ذاتی متجلّی لہٗ کی صورت میں ہوتی ہے۔ فنا کے بعد بقا کے حال میں ہے۔ پس ذاتی تجلّی کے منافی کہ جس میں فناءِ عین بعد الفناء نہیں ہے۔ اس لیے قیصری فصوص کی شرح میں لکھتے ہیں کہ صوفیہ میں یہ مشتہر نہیں ہے کہ تجلّی ذاتی فنا کو واجب کرتی ہے۔ اور دوئی کو ختم کر دیتی ہے۔ بلکہ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب تجلّیِ ذاتی صفت القہر الوحدۃ میں ظاہر ہو جو غیریت کے ارتفاع کا مقتضی ہے اس لیے یہ القہار وحدۃ القہار کے ساتھ آیا ہے۔ قولہ تعالےٰ: لمن الملك اليوم لله الواحد القهار اور ہم کہتے ہیں کہ ابنِ عربی رضی اللہ عنہ کا قول فنا کے بعد بقا کے حال پر محمول ہے۔ اور فی الوقت پھر فنا واجب نہیں ہوتا۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ شیخ میہنہ شیخ ابو سعید ابی الخیر عیں واثر کے مستقل زوال کے قائل ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں: ؎

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) یہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو رحمانی اور شیطانی روشنی میں تمیز کر سکتے ہوں۔ (قیصری)

۶۵ق پانی سے مراد وجودِ مطلق اور برتن سے موجوداتِ مقیدہ اور یہ جنید قدس سرہٗ کا قول ہے، جیسا کہ لمعات میں ہے۔

چنداں برو این رہ کہ دوئی برخیزد | تا ہست دوئی راہروی برخیزد
تو او نشوی ولیک گر جہد کنی | جائی بری کز تو توئی برخیزد

[باقی نہ رہے تجھ یہ فرقِ من و تو | جب ہے دوئی تو ہے نقط اور نہیں ٹو
تو وہ نہیں سکتا مگر کوشش کر | پھر دیکھ کہ ٹو رہتا ہے مٹ جائے گا تو]

صاحبِ نفحات (جامی) شیخ میہنہ ابو سعید ابوالخیر کے احوال میں لکھتے ہیں کہ محمد ابو نصیر حبیبی نے خواجہ ابو بکر خطیب کے واسطے سے شیخ میہنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا آثار محو ہوتے ہیں؟ شیخ نے جواب دیا لا تبقی ولا تذر[۵] جب عین نہیں تو اثر کہاں رہے گا۔ خواجہ نے سر جھکا یا اور کہا کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ نے کہا کہ یہ عقل سے بیان میں نہیں آسکتا۔ ان اشعار کو یاد کر لو اور انھیں سنا دو۔

جسمم ہمہ اشک گشت وچشمم بگریست | میری آنکھیں اتنا روئیں کہ میرا سارا جسم اشک بن کر بہہ گیا۔
درعشقِ تو بی جسم ہمی باید زیست | ہاں، تیرے عشق میں بغیر جسم کے زندہ رہنا چاہیے۔
از من اثری نماند یعنی عشق از چیست؟ | میرا تو کوئی اثر ہی باقی نہیں ہے یہ عشق کیسے ہے؟
چون من ہمہ معشوق شدم عاشق کیست؟ | جب میں خود ہی سراپا معشوق ہو گیا تو عاشق کون ہے؟

اس مقام پر شیخ محمد ہاشم کشمی 'زبدۃ المقامات' میں امام ربّانی سے نقل کرتے ہیں کہ جب اسم اور صفت ملحوظ رہیں گے تو لاجرم عارف کا عین ثابتہ درمیان میں حائل رہے گا اس لیے عین کا زوال متحقق نہیں ہو سکتا۔ پھر فرمایا صاحبِ فصوص قدس سرہٗ (ابن عربی) عین کے زوال کے مطلقاً

۵۔ یعنی حقیقت جب ظاہر ہوتی ہے تو کچھ بھی نہیں چھوڑتی سب لے جاتی ہے پس طبیعت جو آثار و افعال کا مبدأ ہے وہ چلی جاتی ہے اور کسی چیز کے مبدأ کا انتفا (اس چیز کے انتفا) کا مستلزم ہے اس لیے جب طبیعت ہوتی نہ رہی تو اثرِ طبیعت کے رہا۔ لیکن اب جو آثار ظاہر ہوتے ہیں وہ طبیعت کے آثار کی صورت پر ہوتے ہیں۔
[ملّا غفور بر نفحات]

۶۔ زوالِ عین و اثر سے شیخ ابو سعید کی مراد سالک کا زوالِ علم و شعور ہے مراد شیخ محی الدین ابنِ عربی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

قائل نہیں ہیں اور تجلّی ذاتی کو صرف متجلّی لہٗ کی صورت میں ثابت کرتے ہیں۔ جہاں فصّ شیشہ میں لکھتے ہیں: ذات کی تجلّی صرف متجلّی لہٗ کی صورت میں ہوتی ہے مگر متجلّی لہٗ اپنی صورت کو نہیں دیکھتا مگر حق کے آئینہ میں۔ پھر فرماتے ہیں کہ عین معلومات الٰہی میں سے ہے۔ اگر زائل ہو جائے تو علم الٰہی میں انقلاب ماننا پڑے گا! اور اس کے لیے جہل لازم آئے گا اور یہ محال ہے اور ایسا اعتقاد گُم راہی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ عین اور اثر ہر دو زوال پذیر ہیں۔ چناں چہ کلام شیخ بلند سیر ابو سعید ابی الخیر قدس سرّہٗ اس مطلب کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر یہ کہ عین کے زوال کو ماننا اور اثر کے زوال کو منع کرنا ان کے اس مقولہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عین کا زوال اس سے کلیتہً متحقق نہیں ہوا کیوں کہ اثر عرض ہے اور عین جوہر۔ جب جوہر نہ رہا تو اثر کیسے قائم رہے گا۔ جب سر ہی نہ رہا تو دردِ سر کہاں! اس کے بعد شیخ میہنہ ابو سعید ابی الخیر کی رباعی جو سائل کے جواب میں محوِ اثر کے متعلق تھی پڑھی گئی۔ اس کے مصرعہ چہارم کو بار بار پڑھتے اور کہتے کہ ہم عین و اثر کے زوال کے متعلق شیخ میہنہ کے موافق ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ من معشوق شدم عاشق کیست؟ بلکہ شیخ علاء الدولہ سمنانی کی طرح یہ کہتے ہیں کہ تو ہی برخیزد لیکن دوئی برخیزد۔ لیکن شیخ سمنانی اس کو صرف ایک دم کے لیے مانتے ہیں اور ہم دائمی مانتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تجلّی ذاتی دائمی ہوتی ہے نہ کہ برقی اور یہ بھی فرمایا کہ عین و اثر کا زوال لازم نہیں کرتا کہ دوئی کو زائل کر دے اور ایسا ہوتا بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ہستی جو ظلّ سے ہوتی ہے (وجود ظلّی) اصل سے ودیعت پذیر ہوتی ہے۔ جب اُسے اصل میں فنا کر دیا اس وقت توئی زائل ہو جاتی ہے کیوں کہ تو وہی رہے جس سے تجھے ہستی ودیعت ہوئی ہے لیکن دوئی برقرار رہتی ہے۔ کیوں کہ ظلّ اصل نہیں ہے۔ تو سمجھا جس نے سمجھا۔

کلامِ امامِ ربّانی[16] کے مکتوب ۲۸۷ جلدِ اول میں ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عروجِ محمّدی جب شیون کی طرف ہوتا ہے اور شیون کو عالم سے کوئی نسبت نہیں بلکہ عالم صفات کا ظلّ ہے نہ کہ شیون کا ظلّ۔ پس فنا دِ سالک شان میں مستلزم فنا مطلقِ سالک ہوگا اس طور پر کہ سالک کے وجود اور اس کے اثر کا کچھ نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ اور اس کا وجود اس کی شان کے ساتھ باقی رہے گا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور ان کے تابعین کی مراد عدم زوال عین و اثر سے زوال علم حق ہے جو محال ہے کیوں کہ اس صورت میں علم الٰہی کو جہل سے منقلب ماننا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔ اس شیخ ابو سعید اور ابن عربی کے قول میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ (محی الدین عفا اللہ عنہٗ) [یعنی حضرت قطبؒ ویلور]

اس کے برعکس جو صفات میں فانی ہوتا ہے' اس صورت میں اپنی خودی سے کلّیتہً محو نہیں کرتا اور بقدار باندازہ فنا ہے۔ پس محمّدی صفاتِ بشریت کے عود کرنے سے بے خوف ہوتا ہے۔ اور خوفِ ردّ سے محفوظ۔ کیوں کہ وہ کلیتاً خودی سے باہر آچکا ہوتا ہے۔ اور حق سبحانہٗ کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اس مقام پر عود ممنوع ہے۔ بخلاف فناء صفات کی صورت میں کہ وہاں پر عود بواسطۂ بقا اثرِ وجودِ سالک ممکن ہے۔ جو اختلاف مشائخ کے درمیان جواز رجوع واصل اور عدم جواز رجوعِ واصل کے متعلق پایا جاتا ہے اس سبب سے ہو سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ محمّدی المشرب عود سے محفوظ ہے۔ اور غیر محمدی کو عود کا خطرہ ہے۔ اسی طرح فنا کے بعد وجود سالک کے عین و اثر کے متعلق جو اختلاف ہے۔ اسی سبب سے ہو سکتا ہے۔ غیر محمدی کو عین و اثر کا زوال میسر نہیں ہے۔ کیوں کہ صفت جو اس کی اصل ہے باقی رہتی ہے۔ پس اسی لیے زوالِ ظلّ عین و اثر ممکن نہیں ہے اور محمدی عین و اثر ہر دو کو گم کر دیتا ہے[۴]۔ اس مقام پر اس نکتہ کو نظر میں رکھنا چاہیے کہ عین و اثر کے زوال سے مراد زوالِ شہودی ہے نہ کہ وجودی۔ اس لیے کہ زوال وجود کا قول الحاد و زندیقہ ہے۔ اسی مقام پر اگر لفظ متحلّی لہٗ کو جو کہ کلام ابنِ عربی میں آیا ہے عین و شان کے درمیان اعم تسلیم کریں تو پھر یہ حقیقت کے خلاف ہو جائے گا اور ابن عربی کے کلام میں اس طرح کا احتمال نہیں ہے۔ واللہ اعلم وعلمہٗ احکم ۔

۵ عبد الرزاق کاشی اپنی اصطلاح میں سفر ثالث میں لکھتے ہیں کہ یہ عروج ہے۔ عین الجمع اور حضرت احدیت کی طرف اور یہ قاب قوسین کا مقام ہے۔ یہاں دوئی باقی نہیں رہتی اور جب یہاں سے اور ترقی کی تو وہ مقام او ادنیٰ تک پہنچا اور یہ سیر ولایت کی انتہا ہے۔

شیخ محمود بحری معراج محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں اسی او ادنیٰ کے مقام کی طرف حدیث سے استناد کر کے اشارہ کرتے ہیں۔

پردہ او جو بیچ تھا گیا پھٹ	دیدار ہوا ادھی کا سیوٹ
کھل صاف رسیا جو بیچ تھا پیچ	آپی سو وہی سو آپیچ
احمد کے اشارتاں پو گیا نی	معلوم کئے ہیں من رآنی

فقد رای الحق۔

حواشی

پچھلے صفحات میں فائدہ ۱۷ شترہ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب مع پادرق کے جواہر السلوک کی تحریر کا ترجمہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں وضاحت کے لیے قوسین میں کوئی جملہ لکھا گیا ہے وہ مترجم کی طرف سے ہے

ع۱ء توحید کے اقسام لکھنا درست نہیں ہے۔ حضرت قطبِ ویلور نے بھی اکثر اقسام کی بجائے مراتب کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض عام فہم بنانے کی غرض سے حضرت قطبِ ویلور نے کبھی مراتب کے لیے لفظ اقسام استعمال کیا ہے۔ یعنی اقسام سے مراد مراتب ہی ہیں۔

ع۲ء شیخ داؤد قیصری (متوفی ۷۵۱ھ) شارحِ فصوص الحکم: ابنِ عربی (م ۶۳۸ھ) کے موافقین میں ہیں۔

ع۳ء مراتب توحید سے متعلق محض اشکالات اور ان کے جوابات راقم کی کتاب تصوف: صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ پر ملاحظہ فرمائیں: طوالت کے خیال سے یہاں نقل نہیں کیا جارہا ہے۔

ع۴ء مثلاً زید اگر شاعر ہے اور شہسوار بھی ہے اور تیر انداز بھی ہے تو ان الگ الگ افعال کی وجہ سے زید میں کو تعدد نہیں واقع ہوگا اور وہ تو ایک ہی فاعل کی حیثیت سے رہے گا۔

ع۵ء مثلاً عربی میں لفظ واحد شمار کے لیے استعمال کے لیے ہوتا ہے اور جو چیز قابلِ شمار ہوگی وہ محدود ہوگی۔ اس اشکال کا مفصل جواب راقم کی کتاب تصوّف میں وحدۃ الوجود کے بیان میں ملے گا۔

ع۶ء اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کاملین سے کامل ارادت اور نسبتِ تام رکھنے سے بھی توحید کی یہ معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔ جو سب سے بڑی دولت ہے۔ اس ارادت کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ع۷ء مولانا عبدالرحمٰن جامی نے صاحبِ ترجمۂ عوارف کا نام نہیں لیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے جس کتاب سے نقل کیا ہے وہ ترجمۂ عوارف المعارف نہیں ہے۔ اس کا نام مصباح الہدایہ ومفتاح الکفایہ ہے۔ اس کے مصنف کا نام عزالدین محمود کاشانی (متوفی ۷۳۵ھ) ہے۔ ان کا سلسلۂ ارادت شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) تک پہنچتا ہے۔

ع۸ء شیخ ابوسعید ابی الخیر مشہور صوفی اور رباعی گو شاعر تھے۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے۔

ع۹ء صغیر وکبیر یہ صوفیا کی اصلاحیں ہیں۔ صغیر سے مراد انسان اور کبیر سے مراد

کائنات ۔ ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ظہور ہوتا ہے ۔ عالم کبیر، عالم صغیر میں یعنی انسان میں پوشیدہ ہے اور چوں کہ انسان کے اندر اس کی صفات کا ظہور بدرجۂ اتم ہوا ہے ۔ اسی لیے ایک لحاظ سے انسان عالم کبیر ہے اور کائنات عالم صغیر ۔

۱۶؎ امام ربانی کا نام احمد، کنیت ابوالبرکات لقب بدرالدین اور خطاب امام ربانی مجدد الفِ ثانی ۹۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور صفر ۱۰۳۴ھ میں سرہند میں وفات پائی پہلے اپنے والد سے طریقۂ چشتیہ میں بیعت ہوئے ۔ والد کی وفات کے بعد خواجہ باقی باللہ سے طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے ۔ آپ کے مکتوبات بہت مشہور ہیں ۔

۱۷؎ جب محمدی المشرب سالک بقار باللہ کے مقام پر پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی محبوبیت سے سرفراز کر کے اس کے دیکھنے، سننے اور کرنے وغیرہ کی قوت بن گیا اور اس کے بعد رجعت بھی ناممکن ہو گئی ۔ یعنے وہ اپنے مقام خدا کی طرف سے محفوظ کر دیا گیا ۔ تو اب یہ مقام اس کے لیے ابدی ہو گیا ۔ موت اس سے یہ روحانی مقام نہیں چھین سکتی اور نہ اس کے روحانی فیضان کو ختم کر سکتی ہے ۔ اپنے مقام پر محفوظ ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا فیضان بعد موت بھی جاری رہ سکتا ہے ۔

۱۸؎ شیخ محب اللہ الہ آبادی عہدِ شاہ جہانی میں ایک جید عالم اور برگزیدہ صوفی تھے شرح فصوص الحکم کے علاوہ آپ کی نہایت اہم کتاب "کتاب التسویہ" ہے ۔ ان کے علاوہ بھی حقائق و معارف میں گراں قدر تصانیف ہیں جن میں سے خاص یہ ہیں : غایت الغایات، انفاس الخواص ، رسالہ بحث الوجود المطلق ، ہفت احکام اور سہ رکنی ۔ تقریباً سبھی کتابیں غیر مطبوعہ ہیں ۔ افاداتِ ابن عربی کے نام سے ایک مختصر کتاب ۱۹۶۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی تھی ۔ شاہ ابو سعید گنگوہی سے بیعت تھے ۔ ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی ۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبالؒ

یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ

نقوشِ طاہر

مہمان نوازی

حضرت مولانا مولوی ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمۃ
سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ ۔ ویلور

اللہ جلّ شانہٗ اپنے کلامِ بلاغت نظام میں مہمان نوازی کی فضیلت و منزلت بیان فرمایا ہے ۔ قرآنِ حکیم میں اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر حضرت ابراہیم پیغمبر علیہ السلام کی مہمان نوازی کے حالات و واقعات سنا کر آدابِ مہمان نوازی سے روشناس کرایا ۔ مہمان نوازی کے آداب و حدود و اُصول و ضوابط مقرر ہیں مہمان نوازی بے شمار محاسن، فضائل و برکات کا باعث ہے ۔ مہمان نوازی کی وہ شان ہے کہ

یہ مضمون حضرت مولانا صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمۃ سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ، ویلور کی نوکِ قلم سے نکلا تھا ۔ جو پچیس سال پہلے "اللطیف" 1969ء میں شائع ہوا ۔ یہ دُرِّ نایاب قارئین کرام کی نذر ہے ۔
ادارہ

پیغمبروں کا یہ پسندیدہ طرزِ عمل اور محبوب مشغلہ تھا ۔ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین مہمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور خاطر مدارت کا برتاؤ کرتے رہے ۔ نیک سیرت بادشاہوں نے مہمان کی خاطر کے لیے مہمان خانے تعمیر کئے اور ان کی عزت افزائی فرمائی ۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان اپنے ساتھ دو چیزیں لاتا ہے ایک تو قسمت، دوسری برکت ۔ قسمت سے

تو کھاجاتا ہے اور برکت چھوڑجاتا ہے۔ اگر کوئی مہمان تین دن سے زیادہ ٹھہرے تو مزید خاطر تواضع مہمان کا حق نہیں ہے بلکہ اب جو کچھ میزبان حسنِ سلوک کرتا ہے، اُسے صدقہ کا ثواب ملے گا۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے پاس جب کوئی مہمان آتا تو آپؑ اس قدر مسرور ہوتے کہ دُنبہ ذبح کرکے اپنے مہمان کی ضیافت تازہ گوشت سے کرتے اور اکثر آپؑ مہمان کی تلاش میں رہتے۔ کھانا مہمان کے ساتھ تناول فرماتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضورؐ جب ہم فلاں قبیلہ کے لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہماری باقاعدہ مہمان نوازی نہیں کرتے تو ہم اُن کی مہمان نوازی کیوں کریں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: اگر وہ نہ کریں تو یہ ان کی اخلاقی کم زوری ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے تم اپنی اخلاقی کم زوری کا ثبوت کیوں دو۔ تم پر اپنا اخلاقی فریضہ ہے کہ اپنے مہمان کی باقاعدہ خاطرمدارات کرو۔

مہمان پر بھی چند ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ وہ اپنے میزبان کی سلامتی، فلاح و بہبودی چاہیں۔ میزبان کے لیے دُعائے خیر کریں۔ بے جا فرمائش نہ کریں۔ میزبان پر اس کی مقدرت سے زیادہ بار نہ ڈالیں۔ میزبان جو بھی اپنی حیثیت کے موافق انتظام کرے اُسے بہ خوشی قبول کریں۔ مہمان کو چاہیے کہ وہ اپنے میزبان کی حالت وسہولت کا خیال رکھے۔ اسی طرح میزبان کو بھی چاہیے کہ اپنے مہمان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے اور فراخ دلی سے پیش آئے۔ دل میں کچھ تنگی یا بار محسوس نہ کرے۔

حضرت مولانا ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرماتے تھے کہ مہمان کی آمد باعثِ مسرت ہونی چاہیے۔ اللہ عزّوجل رزاق ہے۔ بندہ جہاں جاتا ہے اپنا رزق ساتھ لے جاتا ہے۔ لہٰذا اس نے جو کچھ کھایا پیا وہ اس کے مقسوم کا تھا آیت کریمہ ہے: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا: یعنی ہر جان دار ذی روح کا رزق اللہ کے ذمّہ ہے۔ لہٰذا بندہ جب تک اس دنیائے فانی میں زندہ رہے گا اس کا رزق اللہ کی طرف سے اُس کو برابر ملتا رہے گا۔ خواہ اپنے وطن میں ہو یا غریب الوطن ہو۔ جب قانونِ قدرت یہ ہے تو بندہ محض ایک ذریعہ ہے

ورنہ حقیقی رزق رساں حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا بندہ کو چاہیے کہ اس خدمت کی ادائیگی پر اپنے معبود حقیقی کا شکریہ ادا کرے۔

اس سلسلہ میں آپ نے ایک مؤثر و دل چسپ واقعہ اپنی زبانِ شیریں بیان سے ذکر فرمایا کہ ایک بادشاہ کے پاس کثیر تعداد میں فوج تھی اور اس پر کافی خرچ آتا تھا۔ ایک روز وزیرِ خاص نے بادشاہ سے فوج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جہاں پناہ اس کثیر فوج پر بے شمار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے خزانہ پر کافی خرچ پڑتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو آدھی فوج کم کر دی جائے۔ وزیر کے اس مشورہ پر بادشاہ نے کمی کا حکم دے دیا اور فوراً حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ اسی شب بادشاہ نے خواب دیکھا کہ اس کے خزانہ سے اشرفیوں کی تھیلیاں چلی جا رہی ہیں۔ اور خزانہ خالی ہوا جا رہا ہے۔ اتفاقاً ایک بزرگ اسی حالتِ خواب میں رونما ہوئے۔ بادشاہ ممدوح کے استفسار پر بزرگ نے فرمایا: کہ اتنی کثیر مخلوق اور بندگانِ الٰہی کا رزق تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو پہنچاتا تھا۔ جب تم نے بڑی تعداد میں فوج کو برطرف کر دیا تو ان کا رزق بھی ان کے ساتھ جاتا رہا۔ اس واقعہ کے راز اور اسباب سے آگاہ ہو کر بادشاہ نہایت درجہ متاثر ہوا اور صبح سویرے ہی برخواست شدہ فوج کی بحالی کا حکم نافذ کر دیا اور فوج کے سب سپاہی اپنے کام پر مامور ہو گئے۔ اسی شب بادشاہ نے پھر خواب دیکھا کہ جو اشرفیوں کی تھیلیاں خزانہ سے چلی جا رہی تھیں وہ پھر دوبارہ خزانہ میں جمع ہو رہی ہیں۔ بادشاہ کو سرور و سکون حاصل ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ذیل میں ایک واقعہ ناظرینِ "اللطیف" کی بصیرت اور عمل کے لیے سپردِ قلم کرتا ہوں، جس سے قدرتِ الٰہی کی فیاضیوں کی کرشمہ سازیاں نظر آئیں گی۔

ایک روز ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے۔ دفعتاً وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھنگھور گھٹا اٹھی اور ایک مخصوص سمت میں رواں دواں ہو گئی۔ محترم بزرگ کو اس کی حقیقت جاننے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ فوراً اپنے گھوڑے کو اسی سمت پھیرا اور ابر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک جگہ پہنچ کر بادل خوب برسنے لگا۔ جب وہ زمین کا مخصوص خطہ پانی سے سیراب ہو گیا تو بادل چھٹ گیا۔ اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر بزرگ موصوف نے مالکِ زمین سے ملاقات کی اور اس حقیقت کا راز معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے

جواب میں کہا کہ اس زمین میں جو اناج پیدا ہوتا ہے، اس کے تین حصّے کیے جاتے ہیں۔ ایک حصّہ تخم پاشی کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ دوسرا حصّہ مساکین و غربا میں تقسیم کیا جاتا ہے اور تیسرا حصّہ اپنے اہل و عیال اور خویش و اقارب کے لیے رکھا جاتا ہے۔ یہ اسی حسنِ عمل کا نتیجہ اور خیر و برکت ہے۔ جو آپ نے مشاہدہ کیا۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ خود بندے کے ساز و سامان کی درستگی کا ضامن و کفیل بن جاتا ہے۔ اور اسے ضائع و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے۔

مہمان نوازی کی اہمیت و فضیلت کا صحیح اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے فرمائیے:

اب سے کوئی ایک صدی قبل حضرت قطبِ ویلور رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مدینۂ منوّرہ میں ہوا۔ اس وقت آپ کے صاحب زادۂ بلند اقبال حضرت مولانا رکن الدّین سیّد شاہ محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی مدینۂ منوّرہ میں تھے۔ ایسے وقت ایک قندھاری حضرت مکان آئے اور مسجد میں ٹھہر گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شہر کی آبادی زیادہ نہ تھی۔ اس لیے شام ہوتے ہی شہر ویران معلوم ہوتا تھا۔ نہ بجلی کی روشنی تھی اور نہ ہی یہ چہل پہل تھی۔ سرِ شام ہی لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چلے جاتے تھے۔ قندھاری صاحب کی آمد کا کسی کو مطلق علم نہ ہوا۔ اسی شب خواب میں پیرِ روشن ضمیر و صاحبِ ولایت و کرامت حضرت قطبِ ویلور رحمۃ اللہ علیہ جن کا وصال مدینۂ منوّرہ میں ہو چکا تھا اور یہاں اس وقت کوئی نہ تھے۔ اپنی خادمہ سے کہا کہ اپنے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں اور کسی کو خبر نہیں؟ خادمہ نے پوچھا کہ حضرت کون صاحب ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ فلاں سیّد صاحب قندھاری ہیں جو مسجد میں مقیم ہیں۔ خادمہ نے کہا کہ سالن نہیں ہے۔ آپ نے جذبہ سے فرمایا کہ چٹنی ہی کافی ہے۔ فوراً ہی خادمہ نیند سے بیدار ہوئی اور کھانے سالن کا انتظام کیا۔ اس درمیان رات کافی گزر گئی تھی۔ اس لیے صبح کی اذاں کی منتظر تھی۔ جونہی موذن نے صدائے اللہ اکبر بلند کیا مہمان کے سامنے کھانا پیش کیا گیا۔

مہمانِ موصوف کو بڑی حیرت ہوئی کہ بے نشان و گمان جب کہ میری آمد کا کسی کو علم نہیں تھا یکایک صبح سویرے کھانا تیار ہو کر کیسے آگیا؟ آپ نے متعجبانہ خادمہ سے اس کا سبب دریافت کیا اور اس وقت کھانے سے انکار کیا جب تک حقیقتِ حال معلوم نہ ہو۔ خادمہ کو مجبوراً پچھلی شب کے خواب کا معاملہ بیان کرنا پڑا۔ معزز مہمان نے کہا تم نے خواب کے بعد معاملہ کی تحقیق کیوں نہ کرلی۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ خواب صحیح تھا اور آپؒ قیامِ خواب

کی صحت کی دلیل ہے۔ قندھاری صاحب اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور بعدازاں تناول فرمایا

بزرگانِ دین بہ قیدِ حیات ہوں یا رحلت فرما چکے ہوں مہمان کی قدر و منزلت اور مہمان نوازی کے لیے وہ ہر حال میں تاکید و ہدایت فرماتے رہتے ہیں۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی مہمان نوازی کا بھی ایک واقعہ مشہور ہے۔ جس کو مختصراً پیش کرتا ہوں۔

آپ کے زمانۂ سیر و سیاحت میں کسی دوست نے آپ کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی شیخ سعدی نے بخوشی منظور کر لیا اور کچھ عرصہ تک وہاں قیام کا ارادہ کر لیا۔ کھانے کے وقت دستر خوان بہت ہی پُر تکلّف اور انواع و اقسام کے کھانوں، میوہ جات اور مشروبات سے چُنا ہوا تھا شیخ صاحب جب یہ منظر دیکھتے تو متاسفانہ کہتے کہ "ہائے دعوتِ شیراز" ہر وقت کھانے میں اس دوست کا یہی معمول رہا اور رہا یا نہ ضیافت میں کوئی کسر باقی نہ رکھتا۔ جب شیخ نے میزبان کی حد سے زیادہ تکلّفات کو ملاحظہ فرمایا تو وہاں مزید قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور میزبان سے رخصت ہو کر بہت جلد واپس آ گئے۔ واپسی کے وقت شیخ سعدی نے دوست کو اپنے وطن شیراز آنے کی دعوت دی جس کو انہوں نے بھی بصد شوق قبول کیا۔ چند دن بعد وہ شیراز آئے اور شیخ سعدی کے مہمان رہے۔ دورانِ قیام میں دستر خوان پر وہی سیدھا سادا کھانا جو عموماً لوگ روزمرّہ کھاتے ہیں پیش کر دیا جاتا اور دونوں ساتھ کھا لیتے۔ ایک روز دوست نے ازراہ تعجب کہا کہ آپ دعوتِ شیراز کو بہت یاد کرتے تھے۔ کیا یہی دعوتِ شیراز ہے؟ اور یہ اس سے بہتر ہے۔ شیخ سعدی نے فرمایا دعوتِ شیراز یہی ہے۔ اس طرح اگر تم میرے پاس سالہا سال قیام کرو بلکہ زندگی بھی گزار دو تو مجھے کوئی بار یا گرانی محسوس نہ ہوگی لیکن آپ کی پُر تکلّف دعوت کی صورت میں اگر میں چند دن اور وہاں مزید قیام کرتا تو باعثِ زحمت و کلفت اور بارِ خاطر ہو جاتا۔ اسی وجہ سے میں آپ کے یہاں زیادہ قیام نہ کر سکا۔ لیکن اس میں نہ میزبان کو تکلیف اور نہ مہمان کو۔ آپ جتنے بھی دن چاہیں قیام کر سکتے ہیں ورنہ تکلّفات میں ضرور تکلیف ہوتی ہے۔ اور مہمان کی آمد باعثِ تنگی و پریشانی ہوگی۔

اللہ عزّ و جل اسلام کے اصول و آداب و حدود پر چلنے کی ہدایت دے اور مہمان نوازی کی توفیق عطا کرے۔ (آمین ثم آمین) ◆◆◆

فلسفۂ قربانی

مولانا ابوالحسن محمد رمضان القادری کلیان پوری استاذ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

دراصل قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو پروردگار عالم کے حضور پیش کرتا، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھیے کہ اُسے یہ گوارا نہ ہوا، اس لیے حکم دیا کہ تم جانور کو ذبح کرو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے اپنے آپ کو قربان کردیا۔ تمام کامیابیوں کا راز قربانی میں مضمر ہے۔ بغیر اس کے کامیاب ہونا غیر ممکن ہے۔ خواہ مال کی قربانی ہو یا جان کی قربانی۔ حتیٰ کہ دین کی شان اور اسلام کا ایک بڑا نشان ہے۔ اللہ عزوجل نے جملہ انبیاء و مرسلین کی امتوں کے لیے قربانی کا حکم نازل فرمایا: مثلاً وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُم مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ: ہر ایک امت کے لیے ہم نے ایک قربانی مقرر کردی ہے تاکہ جن بے زبان جانوروں پر اللہ کا نام ذکر کریں: قربانی ربّ جلیل کے مقدس خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و مرسلین کی سنت ہے اور پروردگار عالم کے دربار میں بندوں کی بہترین عبادت ہے۔

یوں تو جملہ اعمال میں اخلاص و للّٰہیت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن قربانی میں اس سے کہیں بڑھ کر اخلاص و للّٰہیت، ایثار و فداکاری، ایمان داری و نیکوکاری، تقویٰ و پرہیزگاری کا کمال ہونا بے حد ضروری ہے جیسا کہ حسب ذیل آیت کریمہ دعوت عبرت دے رہی ہے: لَن یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِن یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنکُمْ: اللہ کو ہرگز نہ ان کا گوشت پہنچتے ہیں۔ نہ ان کے خون ہاں تمہاری پرہیزگاری اس تک باریاب ہوتی ہے۔ (کنز الایمان)

جانتا ہے بارگاہِ حق کے آئین و اصول　　دل کے ٹکڑوں کی یہاں پہ نذر ہوتی ہے قبول

زیرِ نظر مقالہ میں جان و مال کی قربانی کی حکمت و فلسفہ پہ سرسری طور سے جائزہ لیا جارہا ہے۔

چوں کہ جان و مال کو ایک دوسرے سے اچھا خاصا لگاؤ ہے اور پروردگار عالم کے دربار عالی شان میں ان دونوں کی قربانی پیش کرنا بندوں کے لیے بندگی کے اظہار کا بہترین خراج عقیدت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے سے کچھ کمی واقع نہیں ہوتی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں تو دیکھتی ہیں کہ جو مال اللہ کے راستے میں خرچ کیا جارہا ہے وہ اسراف ہے یا بے فائدہ ہے۔ لیکن حقیقت کا گر مشاہدہ کیا جائے تو وہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ آفاقی پیغام ملاحظہ فرمائیں:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مأۃ حبۃ ط واللہ یضاعف لمن یشاء ط واللہ واسع علیم۔ ان کی کہاوت جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح جس نے اوگائیں سات بالیں ہر بال میں سو دانے اور اللہ اس سے بھی زیادہ بڑھائے جس کے لیے چاہے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ (کنز الایمان)۔

تفسیر نعیمی خزائن العرفان میں ہے کہ خواہ خرچ کرنا واجب ہو یا نفل تمام ابواب خیر کو عام ہے۔ خواہ کسی طالب العلم کو کتاب خرید کر دی جائے یا کوئی شفاخانہ بنا دیا جائے یا اموات کے لیے تیجہ، دسویں، بیسویں، چالیسویں کے طریقہ پر مساکین کو کھانا کھلایا جائے۔ نیز یہ بھی ہے کہ اُگانے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دانہ کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسناد مجازی جائز ہے۔ جب کہ اسناد کرنے والا غیر خدا کو مستقل فی التصرف اعتقاد نہ کرتا ہو۔ اس لیے یہ کہنا جائز ہے کہ یہ دوا نافع ہے، یہ مضر ہے یہ درد کے لیے دافع ہے۔ ماں باپ نے پالا، عالم نے گمراہی سے بچایا، بزرگوں نے حاجت روائی کی وغیرہ سب میں اسناد مجازی ہے۔ اور مسلمان کے اعتقاد میں فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے باقی سب وسائل ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک کھجور کے بقدر بھی صدقہ کرے بشرطیکہ طیب مال سے ہو خبیث مال نہ ہو اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ طیب مال ہی پسند فرماتا ہے۔ چناں چہ حق تعالیٰ اس مال کی پرورش فرماتا ہے۔ جیسا کہ تم لوگ اپنے بچھڑے کی پرورش کرتے ہو۔ حتی کہ وہ صدقہ بڑھتے بڑھتے پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ مشکوٰۃ صدقہ اور خیرات کرنے میں محبوب ترین چیزوں کا مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اسی کی جانب قرآن پاک نے اشارہ فرمایا ہے کہ:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ط یعنی تم ہرگز ہرگز اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیزوں کو نہ خرچ کرو۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو قرآنی احکام کے اولین مخاطب اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلاواسطہ

شاگرد اور احکام قرآنی کی تعمیل کے عاشق تھے۔ اس آیت کے نازل ہونے پر ایک ایک نے اپنی محبوب چیزوں کو نظر ڈالی اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخواستیں ہونے لگیں۔ ایک مثال عرض ہے، اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے تمام مال میں بیرحاء مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ جس کام میں پسند فرمائیں صرف فرمادیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ تو عظیم الشان منافع کا باغ ہے۔ میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ اس کو آپ اپنے اقرباء اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردو۔ چنانچہ حضرت ابو طلحہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کو قبول کرلیا اور اپنے اقرباء اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم فرمادیا۔ (متفق علیہ) اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ خیرات صرف وہ نہیں جو عام فقراء اور مساکین پر صرف کی جائے۔ اپنے اہل وعیال اور عزیز واقارب رشتہ داروں کو دینا بھی بڑی خیرات اور موجب ثواب ہے۔ (معارف القرآن)

نیز محبوب چیز مال ہوتا ہے۔ مال سے بھی زیادہ جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ کیوں کہ جان دار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر بے جان چیز ضائع ہوجائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے کہ اگر فنا ہوگیا تو دوسرا نہیں ملتا۔ اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہوکر ہی نفع پہنچاتا ہے۔ مثلاً کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہے تو وہ بے کار ہے اس لیے کہ اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرلے۔ تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتا تو "رضائے حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ کیسے بغیر محبوبات کی قربانی کے حاصل ہوسکتی ہے؟ اور محبوبات کیا ہیں؟ جان ومال، اولاد و آبرو اور غیرت، چناں چہ ارشاد ہے:۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنّت کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ الغرض ان میں سے آپ کو ہر چیز لٹانی ہوگی۔ تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔ درحقیقت جنّت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پہ گھس کر دیکھا جاتا ہے۔ اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ نہیں۔ گویا اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے، ان لکیروں کی نہیں ہوتی جو کسوٹی پہ چڑھ جاتی ہیں۔ بس اسی طرح

آخرت کے بازار میں جنت کے عوض میں ایمان کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور ہمارے یہ اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامات ہیں۔ اس لیے جنت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں محبوباتِ نفس کو قربان کرنا لازمی ہے۔ اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔ عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔ یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیے: یا رسول اللہ! مجھے آپؐ سے محبت ہے۔ فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو: انہوں نے پھر یہی عرض کیا "مجھے آپؐ سے محبت ہے۔ اور آپؐ نے پھر وہی فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا: مجھے آپؐ سے محبت ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: "تیار ہو جاؤ" مصیبتیں جھیلنے کے لیے، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کے لیے اور آفتیں سہنے کو۔ ظاہر سی بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ اپنے عیش و آرام کو قربان نہ کرے۔ گویا محبت کی آزمائش قربانیوں سے ہوتی ہے۔ عشق کرنے والے کو وحدت کا مزہ ملتا ہے

گر عشق سچّا ہو تو بندے کو خدا ملتا ہے

مذکورہ دلائل و شواہد سے فی سبیل اللہ مال کی قربانی یعنی صدقہ اور خیرات کرنے کی حکمت ظاہر ہوی کہ اللہ تعالےٰ غیب سے ان مالوں میں برکت عطا فرماتا ہے جو کہ پوشیدہ نہیں ہے۔

اب ذرا جان کی قربانی کا جائزہ لیں کہ جو جان رضائے الٰہی کی غرض سے خود قربان ہوئے یا قربانی کیے جاتے ہیں عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

کون نہیں جانتا کہ سید الشہدا سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کو یزیدیوں نے کربلا کی تپتی ہوی ریگزار سرزمین پر بے آب و دانہ کے شہید کر دیا تھا۔ ان کی اولاد میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہٗ زندہ صحیح و سلامت واپس لوٹے۔ اللہ کا کرم دیکھیے کہ ایک امام زین العابدینؓ کی نسل اور اولاد میں اتنی برکت عطا فرمایا کہ آج روئے زمین پر عرب ہو یا عجم چار دانگِ عالم میں حسینی سادات کرام کی اولاد لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہے۔ ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

الغرض خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے سے ہرگز ہرگز کچھ کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ جان و مال کے حق میں قربانی کا وہی اثر ہوتا ہے جو موسم بہار کا گلشن و گلزار پر اثر ہوتا ہے۔ جس طرح خشک اور مردہ زمین موسلا دھار بارش کے اثر سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اسی طرح

قوموں کی جان و مال کی خشک کھیتیاں قربانیوں کی بارانِ رحمت سے ہری بھری ہو کر لہلہانے لگتی ہیں۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے :۔

اے مسلماں سن یہ نکتہ درسِ قرآنی میں ہے — عظمتِ اسلام و مسلم صرف قربانی میں ہے
زندگی جاویداں مومن کی قربانی میں ہے — لذتِ آبِ بقا تلوار کے پانی میں ہے

مشکوٰۃ شریف میں ہے :

عن زید ابن ارقم قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ ماھذہ الاضاحی قال سنۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام فقالوا فمالنا فیھا یارسول اللہ قال بکل شعرۃ حسنۃ قالوا فالصوف یارسول اللہ قال بکل شعرۃ من الصوف حسنۃ : (رواہ احمد وابن ماجہ)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ السلام نے عرض کیا یا رسول اللہ قربانیاں کیا ہیں۔ فرمایا : تمہارے باپ ابراھیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ عرض کیا کہ ہمیں کیا ملے گا ؟ فرمایا : ہر بال کے بدلے نیکی۔ عرض کیا کہ اون یا رسول اللہ تو فرمایا اون کے ہر بال کے عوض نیکی۔

اس حدیثِ پاک کے تحت حضرت مولانا حکیم الامت الحاج مفتی احمد یار خاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ نعیمی اشرفی مرأۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں فرماتے ہیں کہ پوچھنے والوں کو خیال یہ ہوا کہ اون کے بال تو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اتنی نیکیاں ایک قربانی میں کیسے مل جائیں گی ؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دینے والا بڑا کریم ہے وہ اپنے کرم سے اس سے بھی زیادہ دے تو کون اسے روک سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قربانی کی بجائے قیمت یا بازار سے گوشت خرید کر خیرات نہیں کر سکتے کیوں کہ پھر ثواب کے لیے بال کہاں سے آئیں گے ؟ (مرأۃ المناجیح) قربانی کے جانور کے چھوٹے سے چھوٹے اور حقیر سے حقیر بال کے بدلے اتنی بڑی سے بڑی اور عظیم سے عظیم تر نیکی ملتی ہے کہ بندے اس نیکی کی عظمت کا تصور اور اس کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اس کے فضل و کمال کے تعلق سے قرآن ببانگِ دہل اعلان فرما رہا ہے : ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ہ

ایک اور حدیثِ شریف ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما عمل ابن اٰدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفساً۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان بقرعید کے دن کوئی ایسی نیکی نہیں کرتا جو خون بہانے سے خدا کو زیادہ پیاری ہو۔ یہ قربانی قیامت میں اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گی اور خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں قبول ہو جاتی ہے۔ لہذا خوش دلی سے قربانی کرو۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

اس سے معلوم ہوا کہ قربانی میں مقصود خون بہانا ہے گوشت کھایا جائے یا نہ کھایا جائے لہذا اگر کوئی شخص قربانی کی قیمت ادا کر دے یا اس سے دُگنا گوشت خیرات کر دے قربانی ہرگز ادا نہ ہو گی اور کیوں نہ ہو کہ قربانی حضرت خلیل اللہ کی نقل ہے۔ انہوں نے خون بہایا تھا۔ گوشت یا پیسے خیرات نہ کئے تھے۔ اور نقل وہی درست ہے جو مطابق اصل ہو۔ خیال رہے کہ اسلام سے پہلے قربانی کا گوشت کھانا حرام تھا۔ اسے غیبی آگ جلا جاتی تھی مگر قربانی کا حکم تھا۔ اب کتنے بے وقوف ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں اتنی قربانیاں نہ کرو جس کا گوشت نہ کھایا جا سکے۔ لہذا قربانی کرنے والے کے نیکی کے پلڑے میں رکھی جائے گی جس سے نیکیاں بھاری ہوں گی۔ پھر اس کے لیئے سواری بنے گی۔ جس کے ذریعہ یہ شخص بآسانی پل صراط سے گزرے گا اور اس کا ہر عضو مالک کے عضو کا فدیہ بنے گا۔ (مرقات) دوسرے اعمال تو کرنے کے بعد قبول ہوتے ہیں لیکن قربانی کی قبولیت خون گرنے سے پہلے ہوتی ہے۔ لہذا قربانی کو بیکار جان کر تنگ دلی سے نہیں بلکہ خوش دلی سے کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ارشاد فرمایا: سمنوا ضحایاکم فانها علی الصراط مطایاکم یعنی تم لوگ فربہ جانوروں کی قربانیاں کرو کیوں کہ یہ قربانی کے جانور پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔

مذکورہ آثارہ مبارکہ سے واضح ہوا کہ قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کو قربانی ہی محبوب ہے۔ لیکن بعض ملحد صفت انسان کے خیالِ باطل میں یہ چیزیں ابھرتی ہیں کہ جانور ذبح کرنے کی بجائے اس کی قیمت صدقہ کر دیں یا کسی قومی فنڈ میں جمع کر دیں، دوسرا خیالِ باطل یہ کہ اتنی تعداد میں جانوروں کو ذبح کرنا مناسب نہیں۔ کیوں کہ رفتہ رفتہ ان حلال جانوروں کی نسل بھی ختم ہو سکتی ہے؟

لہذا اختصاراً عرض ہے!

ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لیے اس کی صورت کا اختیار کرنا لازمی ہے۔ مثلاً آپ نماز کو لیجیے کہ اس کی ایک صورت ہے۔ نیت باندھ کر کھڑا ہونا، رکوع وسجود وغیرہ ادا کرنا اور اس کی روح اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے۔ اور اپنی عبدیت اور بندگی کا اظہار کرنا ہے تو اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہو گی۔ اسی طرح زکواۃ اور روزہ وغیرہ عبادات

ہیں کہ ہر ایک کی ایک روح اور صورت ہے تو جو یہ قربانی ہے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے۔ صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثار نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے تقرب الی اللہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ لہٰذا قربانی کے دنوں میں قربانی کرنی ہو گی۔ اس کی قیمت صدقہ اور خیرات کرنے یا کسی قومی فنڈ میں جمع کر دینے سے قربانی کی حقیقت یعنی ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا ہونا محال ہے۔ اسلام نے قربانی کو "من اھراقِ الدَّمْ" کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ جب تک جانور کو ذبح نہیں کیا جائے گا اس وقت تک قربانی کا اجر و ثواب نہیں مل سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اتنی تعداد میں جانوروں کو ذبح کر دینے سے ان کی نسل ختم ہو سکتی ہے" اسے بھی ذہن نشین کر لینا مناسب سمجھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے عرض کیا گیا کہ جو مال یا جان اللہ کے راستے میں قربان کئے جاتے ہیں ان میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مال کے تعلق سے آیت کریمہ اور احادیثِ مبارکہ درج کی گئی ہیں، یعنی جو جانور محض اللہ کے لیے ذبح کئے جاتے ہیں مثلاً گائے، بھینس، اونٹ بکریاں وغیرہ نیز یہ جانور ایسے ہیں کہ ان کی پیدائش مشکل سے دو یا تین بیک دفعہ ہوتی ہیں اور خرچ کا یہ عالم ہے کہ روزانہ ملک میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ذبح کئے جاتے ہیں اس کے باوجود ان کی نسل میں اتنی برکت ہے کہ ایک ایک میدان میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ جمع ہوا ہوتا نظر آتا ہے۔

حلال جانوروں میں اضافہ اور حرام جانوروں میں کمی کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے نام پہ ذبح کئے جاتے ہیں اسی لیے پروردگارِ عالم اس میں بے پناہ برکت عطا فرماتا ہے اور یہ حرام جانور اللہ کے نام پر ذبح نہیں کئے جاتے ہیں اس لیے ان میں برکت کے بجائے ان کی نسل مٹتی اور تعداد گھٹتی چلی جاتی ہے۔

لہٰذا اس قانونِ فطرت سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کی جائے گی وہ ہمیشہ بڑھتی اور ترقی کی راہ پر گام زن ہوتی ہوئی نظر آئے گی اور جو چیز خدا کی راہ میں قربان نہیں کی جائے گی وہ ہمیشہ گھٹتی اور تنزل پذیر ہوتی رہے گی۔ ...... اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو راہِ حق میں جان و مال کی قربانی دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ــ ••

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات مستشرقین کے آئینہ میں

افضل العلماء مولوی سید ریاض الدین لطیفی کڈلوری : استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی اس وقت تک انجیل کے تقریباً پچیس کروڑ نسخے چارسو مختلف زبانوں میں ترجمہ کراکے شائع کرچکی ہے۔ مسلمانوں نے تبلیغ واشاعتِ اسلام کی راہ میں جو کوتاہی کی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو غیر ملکی زبانوں میں پیش کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اسلام کو سمندر کی موج کی طرح بڑھتا ہوا دیکھ کر یورپ کی عیسائی مشنریوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اسلام اور داعئ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پروپیگنڈہ کریں۔ چناں چہ اپنی ضرورت کے مطابق انھوں نے عربی زبان سیکھی اور کتابیں لکھیں۔ ان کا مقصد صداقت کا اظہار اور اسلامی محاسن کو پھیلانا نہ تھا بلکہ وہ اسلام کو عیسائیت کے مقابلہ میں بدنام کرنا چاہتے تھے۔

ہر چند کہ اکثر مستشرقین نے ایسا ہی کیا ہے لیکن ہر قوم اور ہر ملک میں صداقت پسند جماعت بھی ہوتی ہے جس نے اپنے ہی ہم مذہب لیکن متعصب، بددیانت اور خبیث مصنفین کی متعصبانہ کتابوں کی رد میں اسلام کی حقانیت اور حق پسندی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے میں مسٹر جان ڈیون پورٹ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنی کتاب "قرآن اور محمدؐ سے معذرت" کے دیباچہ میں پہلے ہی صفحے پر لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے لکھنے کا ناچیز لیکن مخلصانہ مقصد یہ ہے کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

کی سوانح حیات کو جھوٹی تہمتوں اور الزامات سے پاک کیا جائے اور آپؐ نے مخلوقِ عالم کی فلاح و بہبودی کے لیے جو کچھ کیا ہے اُسے اچھی طرح آشکار کیا جائے۔ ان مصنفین نے تعصب کے جوش میں توحید پرستی کے محافظ کی نیک نامی پر جو دھبّہ لگایا ہے اس قسم کی غلطی کر کے صرف یہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ ان میں خود شرافت اور انسانیت اور علم و تحقیق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے بلکہ انھوں نے انصاف پسندی کے خلاف بھی کام کیا ہے۔"

(مطبوعہ: جے ڈیوی اینڈ سنز۔ لندن)

اس کتاب میں آگے چل کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اقرار کرنے کے بعد مسٹر جان لکھتے ہیں:-

"محمدؐ کی صداقت کی بیّن دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ آپؐ کے عزیز ترین دوست اور اعزا تھے جو آپؐ کی عادات و خصائل سے بخوبی واقف تھے۔ اور باوجود جستجو کے آپؐ میں کوئی ایسی برائی یا خامی نظر نہیں آئی جو ایک بناوٹی، دھوکہ باز شخص میں ہو سکتی ہے۔" (ص: ۱۷)

جن عیسائی مشنریوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (نعوذ باللہ) مکّاری اور دھوکہ باز ہونے کے الزامات لگائے ہیں اور آپؐ کی تعلیمات کو لاحاصل اور بیکار بتلایا ہے ان کے جواب میں مسٹر جان نے اپنی کتاب میں ایک جگہ یوں تحریر کرتے ہیں:

"میں سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ خیال کرنا بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی ذات جس نے ایسے ملک کو وحدانیت کی تعلیم دے کر اصلاح کی ہو، جو صدیوں سے بُت پرستی کی ہولناک حماقت میں مبتلا رہا ہو، جس نے بچوں کے قتل کر ڈالنے کی رسم بد کو مٹایا ہو اور شراب خوری اور جوے بازی سے دُنیا کو نجات دلائی ہو اور جس نے شادی کے لیے پاکیزہ سماجی قواعد بنائے ہوں، کیا ایسی ذات جو ان اصلاحات کے لیے انتہائی حد تک کوشاں رہی ہو 'مکّار' اور 'دھوکہ باز' خیال کی جا سکتی ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں! محمدؐ میں سوائے سچائی اور حقانیت کی تعلیم کے اور کچھ نہ تھا۔ پھر آخر لوگوں کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ وہ سچائی اور حقانیت کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے تھے۔"

لائق مصنف نے اپنی اسی کتاب میں عیسائی معترضین کے ان اعتراضات کا بھی دندان شکن جواب دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعصب عیسائی مورخین

عموماً عائد کرتے ہیں۔ مصنف نے تمام متعصب عیسائیوں کے اعتراضات کو مندرجہ ذیل چار بنیادی اعتراضات کی شکل میں تقسیم کیا ہے :

۱۔ خدا کی طرف سے وحی کا حیلہ کرکے ایک نیا جھوٹا مذہب قائم کیا۔ حالاں کہ وہ صرف (نعوذ باللہ) اپنی نفسانی خواہشات کو رفع کرنے کے لیے ایک ایجاد ہے اور بس !

۲۔ محمدؐ نے اپنا دین تلوار کے زور سے پھیلایا ہے۔ اس طرح انسانوں کی کثیر تعداد کا خون بہایا گیا اور ان پر مصیبتیں آئیں۔

۳۔ اسلام میں تعدّدِ ازدواج کی اجازت دے کر نفس پرستی کی تعلیم دی گئی ہے۔ جس سے انسانوں میں نفسانی خواہشات کو بڑھا دیا گیا ہے : ص ۱۳۲

۴۔ اسلام میں جنّت کی پُر تکلف نوعیت دکھلائی گئی ہے جس میں ہر قسم کا عیش مہیّا ہوگا اور اس سے عوام کے لیے اپنے دین میں کشش پیدا کی ہے۔

مصنف نے اپنی اس کتاب میں ان اعتراضات کے جوابات دیے ہیں جو ہر لحاظ سے بالکل کافی ہیں اور معترضین کے لیے ناقابلِ تردید ہیں۔ جملہ جوابات کی نقل کرنا ناممکن ہے۔ صرف اعتراضات کی نوعیت سے ہی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جوابات کیا ہوں گے۔

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس حالات بہت سے انگریز مورخین نے لکھے ہیں۔ لیکن جس شخص نے کسی قدر حق گوئی سے کام لیا ہے اور اسلام کی سچائی اور حقانیت تسلیم کیا ہے وہ مورخ ایڈورڈ گبن ہے۔

گبن نے خود اس کا اقرار کیا ہے کہ اس کی معلومات کا ذریعہ لاطینی اور فرانسیسی اور انگریزی زبان کے تراجم قرآن ہیں۔ ان کے علاوہ مؤرخ مذکور کی معلومات کا سارا انحصار 'مراکی' ڈاکٹر پریڈو اور موسیو گانزے کی تصانیف اور ابوالفداء کے تراجم ہیں۔ مذہب اسلام کے متعلق اس نے صاف صاف لکھا ہے کہ :

"یہ مذہب شک اور ابہام سے پاک ہے اور قرآن مجید وحدانیت کا بیّن شہادت ہے"۔

اسلام کے ابتدائی ایام کے ذکر میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات وہدایات کے متعلق مصنف مذکور نے لکھا ہے :

"محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نرم دلی نہ تو صرف قبیلہ قریش تک محدود تھی نہ گھر کی چار دیواری تک۔ مقدس رسوم کے موقع پر آپؐ اکثر خانۂ کعبہ میں جایا کرتے تھے۔ جہاں ہر قبیلے

کے لوگوں سے آپؐ ملاقات کرتے تھے اور اُن سے آپؐ انفرادی طور پر بھی گفتگو فرماتے تھے اور انھیں ایک خدا کی پرستش کی تلقین کرتے تھے۔ آپؐ ہر شخص کو اسکے ضمیر کی آزادی دیتے تھے کسی سے زیادتی کا برتاؤ نہ کرتے تھے۔ البتہ قوم عاد و ثمود کے واقعات سے انھیں عبرت کا سبق دیتے تھے۔

جان ڈیون پورٹ اور گبن کے علاوہ ٹامس کارلائل نے بھی انصاف و حق پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ کارلائل خود عربی جانتا تھا۔ کیمبرڈج یونیورسٹی میں کچھ عرصے تک عربی کا پروفیسر بھی رہ چکا تھا۔ چناں چہ شیخ الاکبر کی کتاب "موردُ اللطائف" کے ایک حصّہ کا اس نے لاطینی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

کارلائل نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دُنیا کے دیگر مذاہب کے پیغمبروں اور مختلف مصلحین سے تقابل کرنے کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مصنف کی بے لاگ حق پرستی کا ثبوت ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے:۔

"محمّد (رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بغیر کسی شک کے تمام پیغمبروں میں سب سے باکمال پیغمبر تھے۔ میں خود آپؐ کی صداقت کا مقر ہوں۔ لوگوں نے مذہبی جوش میں آکر آپؐ کے متعلق جو غلط بیانیاں کیں ہیں وہ ہم سب کے لیے نہایت شرم ناک ہے۔"

(ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ: ص: ۶۰)

ایک دوسری جگہ کارلائل لکھتا ہے۔

"آج خدا کی مخلوق کی ایک کثیر تعداد محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فرمان پر ایمان رکھتی ہے، وہ دنیا میں کسی اور چیز کو اس طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جس طرح اسلام کے احکام کو! کیا ہم یقین کرسکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک قسم کا مذہبی فریب ہے جسے خدا کے کروڑوں بندوں نے جن میں سے کتنے مرگئے اور کتنے زندہ ہیں اُسے قبول کرلیا ہے؟ میں تو کم از کم اس قسم کا خیال بھی ذہن میں نہیں لاسکتا اور کچھ اگر کہا جائے تو شاید اس پر مجھے یقین آجائے لیکن میں اس بات کو کسی طرح مان نہیں سکتا۔ اگر دنیا میں فریب اس قدر ترقی کرسکتے تو کون بتا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا کا کیا حال ہوجائے گا۔"

(ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ: ص: ۶۰)

ایک اور انگریز اسٹین لے لین پول نے بھی، جس نے اسلامی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں ہیں اور وہ قرآن کریم کا ترجمہ بھی شائع کرچکے ہیں ایک جگہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آپؐ نہایت پُرجوش آدمی تھے۔ لیکن آپؐ کا یہ جوش نہایت شریفانہ تھا اور ایک پاک مقصد کے لیے تھا۔ آپؐ کی ذات اُن چند افراد میں سے ہے جنھوں نے ایک عظیم الشان پیغام کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ آپؐ خدائے واحد کے پیغامبر تھے۔"

(Muhammad and Muhammadanism) second Edition: P: 131)

"ہمیں بغیر کسی پس وپیش کے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات نے توہمات کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کردیا، جو زمانۂ دراز سے جزیرہ نمائے عرب پہ محیط تھا۔ اسلام میں تمام اجتماعی خصوصیات موجود ہیں۔ برادرانہ محبت اس مذہب کا خاص جزء ہے۔ یتیموں کے حقوق کی بھی حفاظت کی گئی ہے۔ غلاموں کے ساتھ اچھا برتاؤ کا حکم ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ منشیات سے منع کیا گیا ہے۔ جس کے لیے صرف یہی مذہب فخر کر سکتا ہے۔" (لائف آف محمدؐ: جلد: ۴: ص: ۳۲۰)

ڈاکٹر مارکس ڈاڈسن (1909 - 834ء) نے بھی اس طرح حقیقت کا اعتراف کیا ہے:

"کیا محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر تھے؟ لاریب ان میں نبوت کی دو بڑی نشانیاں موجود تھیں۔ انھوںؐ نے خدا کو پالیا تھا جو عام انسانوں کو نہیں ملتا۔ اور ان میںؐ اس سچائی کو پھیلانے کی بھی ایک غیر معمولی اندرونی قوت موجود تھی۔" (محمدؐ، بدھ، اور عیسیٰؑ: ص: 18)

باسورتھ اسمتھ: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"وہ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح ایک مذہب کے پیشوا تھے اسی طرح ایک حکومت کے سب سے بڑے مدبر بھی تھے۔ وہ قیصر و پوپ کا مجموعہ تھے۔ آں حضرتؐ کے پاس نہ باڈی گارڈ تھے، کوئی قلعہ یا محل نہ تھا۔ تاہم ان کے ہاتھ میں ساری قوت تھی.....۔" پھر لکھتے ہیں:

"خدا کی قوت نے انھیں تین چیزوں کا بانی بنایا تھا: (1) واحد قومیت (اُمّت) (2) واحد حکومت (خلافت) اور (3) واحد مذہب (اسلام) آخروقت تک وہ ایک ہی چیز توحیدِ الٰہی کی دعوت دیتے رہے اور یہی وہ فلسفہ تھا جس کے سامنے مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن سچی عیسائیت کو بھی سر جھکانا پڑے گا اور انھیں خدا کا سچا پیغمبر تسلیم کرنا پڑے گا۔"

(Muhammad and Muhammadinism : P: 340)

پروفیسر ایڈورڈ مونتے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتا ہے:

"آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا مذہب اسلام ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو تمام تر معقولیت پر مبنی ہے۔ آپؐ کی تعلیم کی سادگی اور صفائی درحقیقت وہ زبردست قوتیں ہیں جو اسلام

کی ترقی اور تبلیغ میں برابر عمل کر رہی ہیں۔"

(ریپرویگیشن آف کرسچیانٹی اور مسلم اپوزینس: مونتے: ص: ۱۴)

انگلستان کے ایک ہر دل عزیز مصنف مسٹر ایچ۔جی۔ویلز اپنے عقائد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قرآن کو یورپ کے رہنے والوں نے بہت کم پڑھا ہے۔ چناں چہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے بہت سی ایسی باتیں اُس سے منسوب کرتے ہیں جو اُس میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔۔۔۔ قرآن کی تعلیم قوموں کو متحد کرنے والی اور اسی کے ساتھ ان میں علم و ہنر اور دولت پیدا کرنے کا شوق دلانے والی تعلیم ہے۔"

ڈاکٹر جے۔اے۔کانڈی ایک مشہور اسپینی (Spainnnnn) مورخ ہیں۔ اسپین کے عربوں کی جو تاریخ آپ نے لکھی ہے شاید اس سے زیادہ معتبر اور کون سی تاریخ معتبر ہو گی۔ چناں چہ ان کی اس کتاب کا ترجمہ جرمن اور فرانسیسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی تعلیم کی سچائی سے اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اگر کسی شخص کو اس میں شک ہے کہ آپؐ میں شجاعانہ خصائل، روحانی خصوصیات اس قدر موجود نہیں تھیں کہ جس کی بنیاد پر آپؐ دوسروں میں ممتاز تھے تو وہ جائے اور حنین، بدر اور اُحد کے میدانوں کو دیکھے۔"

(کانڈی: ہسٹری آف دی عربس ان اسپین: مترجم: مسٹر فاسٹر: جلد چہارم)

یہ ہیں وہ چند اقتباسات جن میں مختلف عیسائی مصنفین نے اسلام اور داعی اسلام روحی فداہٗ کے متعلق اظہارِ حق کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد مصنفین ہیں جنہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات اور قرآنِ کریم کے احکامات پر نکتہ چینی کے باوجود محاسن و خوبیوں کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ عیسائی مصنفین نے اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کو یورپ کے سامنے اس قدر مسخ شدہ صورت میں پیش کیا ہے کہ حقانیت و صداقت کا ان سے پتہ لگانا ناممکن ہے۔

کاش! ہمارے اہلِ قلم حضرات اس طرف توجّہ فرماتے اور اسلام کی صحیح تعلیمات انگریزی زبان میں پیش کرتے !! ●●

قطبِ دکن

حضرت شاہ خاموش صاحب قبلہ قدس العزیز

سید شاہ محمد فرید الدین حسینی صابری: حیدرآباد (دکن)

حضرت قبلہ کا اسم گرامی حضرت سید خواجہ معین الدین حسینی ہے
شہر محمد آباد بیدر (کرناٹک) میں آپ کی ولادت با سعادت سنہ ۱۲۰۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حضرت سید خواجہ میراں مخدوم حسینی المعروف بہ حسینی پیراں قدس العزیز جو سلسلۂ عالیہ نظامیہ کے صاحب طریقت اور ممتاز مشائخ مانے جاتے تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ یوسف محمد محمد الحسنی صاحب سے ملتا ہے جن کا مزار خلد آباد میں ہے جن کا حضرت سید شاہ راجو قتال حسینی صاحب قبلہ بھی اسم گرامی ہے۔

حضرت شاہ خاموش صاحب قبلہ ابھی بارہ سال ہی کے تھے کہ شوق الی اللہ کا غلبہ شروع اور تلاش حق کی فکر غالب ہوئی۔ آپ تنہا اجمیر شریف حاضر ہو گئے اور کئی سال مزارِ مقدس پر متوجہ رہے وہاں سے ملکِ پنجاب ضلع انبالہ (مانکپور) گئے۔ جہاں ایک برگزیدہ بزرگ حضرت حافظ صوفی موسیٰ صاحب قبلہ قدس العزیز کی خدمت میں چالیس سال رہے۔ خرقۂ خلافت وغیرہ سے مشرف ہوئے۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد پا پیادہ حجاز گئے۔ دو سال مدینۂ طیبہ میں رہ کر واپسی میں تمام ممالک مقدسہ کی زیارتوں سے مشرف ہو کر پھر پنجاب تشریف لائے۔ یو۔ پی، مراد آباد، امروہہ اور رامپور میں سلسلہ کے لوگوں کے اصرار پر وہاں بارہ سال گزار کر حیدرآباد دکن بعہد نواب ناصر الدولہ شاہِ دکن، تشریف لائے۔ حضرت قبلہ وکعبہ ہمیشہ ذکر و شغل اور پاس انفاس میں مستغرق رہنے کی وجہ سے بارہ سال تک کسی سے بات نہیں فرمائے

حضرت کے قیام کے لیے شاہِ دکن نے مکہ مسجد کا عقبی حصہ نذر کر دیا، جو حضرت کی خانقاہ کہلاتی ہے۔ حضرت کو سماع کا بہت ذوق تھا۔

۱۴ ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ کو نمازِ ظہر ادا فرما رہے تھے کہ دوسری ہی رکعت میں روحِ مبارک پرواز کر گئی۔

حضرت قبلہ قدس العزیز ذکر و فکر، مشاغلِ روحانی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی طرف بھی مائل رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوّف کا راز عشقِ الٰہی اور حُبِّ رسول میں مضمر ہے اور شاعری جذباتِ عشق و محبت کے اظہار کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس شغل سے جہاں محبوب کی یاد ہمیشہ دل میں تازہ رہتی ہے وہیں اظہارِ جذبات کے نتیجہ میں محبت بھرے دل کو تسکین بھی مل جاتی ہے۔ پیرانِ طریقت نے بھی سلوک میں اس آلۂ کار کو استعمال فرمایا ہے۔

دکن کے پیرانِ طریقت شعراء میں حضرت شاہ خاموش رح صاحب قدس العزیز اردو غزل گوئی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلیں کافی مقبول ہیں۔ حضرت قبلہ رح کی شاعری کا مرصع عارفانہ اور رنگ کلام عاشقانہ ہے۔ زبان کی سادگی اور سلاست، طرزِ بیان کی بے ساختگی کے ساتھ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک عشق ایک لافانی حقیقت ہے اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہے۔ حضرت قبلہ رح کی نظر میں کسی کو عشق سے مفر نہیں فرماتے ہیں۔ ؎

بازارِ محبت میں فقط ہیں نہیں سرگرم — ہے کون جسے عشق کا سودا نہیں ہوتا

حضرت قبلہ عشقِ مجازی کو بھی یکسر مسترد نہیں فرماتے بلکہ پوری طرح متفق ہو کر فرماتے ہیں: کہ ؎

- عشقِ حقیقی اصل ہے عشقِ مجازی نقل ہے — جز آرزوئے دلربا کچھ آرزو نہ ہو
- ہے عشقِ مجاز اچھا پر فسق نہ ہو دل میں — ڈرتا ہی رہوں اس سے حرفت کے یہ معنی ہیں
- جب تک کہ دور دل سے یہ میں اور تو نہ ہو — چاہے وصال دوست ہو ہرگز کبھو نہ ہو
- عاشقوں کے واسطے دونوں طرف ہے مزہ — وصل کا لطف واہ واہ ہجر کا غم واہ واہ
- نظر آئے نہ آئے زلف کا سایہ بھلا — روز نہ روشن ہو نہ ہو شامِ غریباں چاہیے
- کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا — عاشقاں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا

حضرت قبلہ کے کلام میں وحدۃ الوجود کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: کہ ؎

- جو سب حق ہی حق ہے تو خاموش ہو جا — انا الحق کی تیری عبث گفتگو ہے

Scanned with CamScanner

اور کائنات کے وجود کو حقیقت کا عکس تصور فرماتے ہیں : ؎

ہم نہیں ہیں ہم نہیں ہیں ہم نہیں دیکھتے کو ہم نظر آتے ہیں ہم

بہ اعتبارِ مسلک حضرت کے کلام میں وحدۃ الوجود کے بکثرت اشارے ملتے ہیں : ؎

چھوڑ کر وحدت چلے کثرت کی راہ اس لیے ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

صحرا میں کون کوہ و بیاباں میں کون ہے گلشن میں کون باغ و گلستاں میں کون ہے

صورت جدا ہے سب کی مگر ایک ہے وجود گل میں ہے کون خار مغیلاں میں کون ہے

خاموش دیکھ ارض و سما میں ہے کس کا نور سورج میں کون ماہِ درخشاں میں کون ہے

حضرت قبلہؒ کسبِ حلال کو تصوف کی بنیادی شرط تسلیم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ؎

کانٹے بوئے کہے پھول تو کھاوے کیسے میوہ کھاتا ہے وہی جیسا جو کوئی بوتا ہے

حضرت قبلہؒ اپنے کلام کے ذریعہ معاشرہ کو اس طرح بیداری کا پیغام دیتے ہیں : ؎

آیا جس کام کو ہوشیار ہو کر لے وہ کام دن نکل آیا ابھی تک تو پڑا سوتا ہے کیا

کھیل میں طفلی جوانی گئی سب شہوت میں عمر کچھ باقی ہے اوس کو بھی عبث کھوتا ہے

جا کے دکھلائے گا منھ اپنا کیسے وہاں داغ عصیاں کی سیاہی تو نہیں دھوتا ہے

گویا بیداری اور عمل بھی طریقت میں آثار عشق ہی کا لوازمہ متصور ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے بھی تصوف میں فخر نسب کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : ؎

عشق کی راہ میں نہیں فخر نسب اے خاموش پیرزادہ ہے کسی شیخ کا یا پوتا ہے

تصوف کے فکری نظام میں کفر و اسلام دونوں ہی حکمتِ الٰہیہ کے مظہر ہیں اور تکمیل مشیت سے مامور ہیں۔ صوفیائے کرام ان میں کسی طرح کے تصادم کے پہلو پر نظر نہیں رکھتے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں : ؎

رشتۂ الفت نہ توڑو تم اے شیخ و برہمن پھینک دو تسبیح و زنار ہوتا ہو سو ہو

کا ہیکو کس سے گفت و شنید کیجیے خاموش اس کی دید

یگانہ ہو بیگانہ کوئی کچھ بولو کوئی کچھ بولو !

دینِ الٰہی آفرینشِ عالم سے لے کر آج تک ایک ہی ہے اور اس کی آخری صورت دین اسلام ہے۔ جتنے ادیان وجود میں آئے ان کے پیرو اپنے آپ ہی کو خداوند عالم کے خاص بندے تصور کرتے رہے اور دوسروں کو وہ درجہ بندگی دینے پر آمادہ نہیں ہوتے جس کے وہ خود مدعی ہیں۔ حضرت شاہ

خاموش صاحب قبلہ قدس العزیز نے اس لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین کی طرف یوں توجہ دلائی ہے : ؎

یار وہ سب کا ہے کچھ ایک ہمارا ہی نہیں — پیار اوہ سب کا ہے ایسا کوئی پیارا ہی نہیں

ہمارے بزرگانِ دین نے کس طرح تلاشِ حق میں سرگرداں رہے ، معارفت حاصل کی اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگی کو عبادت و استغراق میں گزارتے ہوئے عوام کو اسلام اور اس کی آفاقیت کا پیام پہنچایا ، یہ کام آج کے دور میں ناممکنات میں سے ہے ۔ لیکن ایسی ہی برگزیدہ شخصیتوں نے اسلام کے استحکام کے لیے جو کام انجام دیا وہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے صوفی ازم اور خانقاہی نظام ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا مذہبی و تہذیبی ورثہ ہے جس کی آج پھر شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے ۔

تسلیم و رضا کا پیغام حضرت قبلہ قدس العزیز نے کن الفاظ اور انداز میں دیا ہے ملاحظہ فرمائیے ۔ ہو سکے تو ان اشعار میں پیش کردہ "حقیقت" کو نگاہ کے راستہ سے دل میں اتار لیجیے ۔ اور اپنی پوری زندگی کو اس کے سہارے گزار دیجیے جس سے آپ کو سکون کی وہ لذت اور اطمینان کی وہ دولت نصیب ہوگی جو دنیا کے بازار میں نہ تو خریدی جا سکتی ہے اور نہ ہی بیچی جا سکتی ہے ۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ : ؎

- خدا کا رستہ چلو صفا ہے ادب سے سر کو جھکا جھکا کر
  مثالِ نقش قدم بنو تم ، غرور ہستی مٹا مٹا کر
- در پہ ہوں تیرے آکھڑا کیا کہوں میں خاموش ہوں
  شاہ بنا ، گدا بنا تیری رضا جو ہو سو ہو
- جفا و جور کیا یا وفا ہوا سو ہوا — ہوا میں راضی جو اس کی رضا ہوا سو ہوا
  بھلا ہوا سو ہوا یا برا ہوا سو ہوا — طرف سے یار کے جو کچھ ہوا ہوا سو ہوا
  میں چھوڑ تجھ کو اے صاحب اور کہاں جاؤں — ازل سے بندہ تیرا ہو گیا ہوا سو ہوا
- کسی سے کچھ نہ کہو دیکھو ہو رہو خاموش — خدا ہی صید بنا یا خدا کیا صیاد
- ستم کو تیرے کب ستم جانتا ہوں — عنایات و لطف و کرم جانتا ہوں

تسلیم و رضا سے متعلق حضرت قبلہؒ کے صرف چند اشعار پیش کیا ہوں ۔ آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ یہ اشعار کس قدر متاثر کن ہیں ۔

اسلام میں تسلیم و رضا کا جو فلسفہ ہے اور جس کو قرآن و حدیث کے علاوہ ہمارے بزرگانِ دین نے مختلف پیرایے اور انداز سے اس کی وضاحت کی ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس فلسفہ کو اپنانے سے پراگندہ خیالی اور انتشارِ فکری سے ایک انسان اسی طرح نجات پاجاتا ہے جیسے کوئی شخص گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی سے نکل کر ساحل پر آگیا ہو۔ علاوہ ازیں قناعت کی دولت بھی ہاتھ آتی ہے۔

غرض کہ حضرت قبلہ قدس العزیز نے اپنے صوفیانہ کلام کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو چاہے وہ عارفانہ ہو کہ عاشقانہ ایک نرالے انداز سے بیان فرمایا ہے۔ ●●

اقوالِ زرّیں

- مومنوں میں کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق ان میں سب سے اچھے ہیں۔ (سرکار دوعالم)
- کتنی شرم کی بات ہے کہ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے پرندے جاگ جائیں۔ (حضرت صدیق اکبرؓ)
- تو کسی پر احسان کرے تو چھپا، کوئی تجھ پر احسان کرے تو سب کو بتا۔ (حضرت علیؓ)
- قرض غلامی اور اس کا ادا کرنا آزادی ہے۔ (حضرت علیؓ)
- بے تحاشا ہنسنے سے شخصیت کا وقار جاتا ہے، عمر کم ہوتی ہے اور یہ موت سے غفلت کی نشانی ہے۔ (حضرت عمرؓ)
- علم دل کو اس طرح زندہ رکھتا ہے جیسا کہ بارش زمین کو زندہ رکھتی ہے۔ (حضرت لقمانؑ)
- جو شخص اپنے آپ کو گمراہ کر لیتے ہیں اُسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا: (حضرت علیؓ)
- یقین سے دل مطمئن ہوتا ہے۔ (حضرت علیؓ)
- شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے: (ٹیپو سلطانؒ)
- امانت میں خیانت نہ کرو اس سے تم بے عزّت ہوجاوگے۔ (نامعلوم)
- زندگی اور موت میں سانس کا فرق ہے۔ (علامہ اقبالؒ)
- ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے۔

مرسلہ: محمد عبدالسبحان متعلم دارالعلوم لطیفیہ ویلور

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا صِلہ

مولوی سیّد الیاس پاشا شطاری لطیفی ۔ سیلم

پروردگار عالم کا بے پناہ شکر واحسان ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کے حسین القاب سے نواز کر ساری مخلوقات پر ایک امتیازی درجہ عطا فرمایا اور مرد وعورت کا ایک ایسا رشتہ قائم فرمایا کہ صبح قیامت تک یہ مخلوق آتی اور جاتی رہے گی ۔ نسل انسانی کا نشیب وفراز جاری رہے گا ۔ اسی مخلوق کے لیے اللہ تعالےٰ نے آخرت میں جنّت و دوزخ کا ٹھکانا بنایا ہے جو کہ عقائد و اعمال کی بنیاد پر منحصر ہوں گے ۔ درجات اور حقوق بھی متعین کئے گئے ہیں ۔ خصوصاً ماں اور باپ کی عظمت و بزرگی، ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی، ان کے حقوق کی ادائیگی اور فرماں برداری کے سلسلے میں قرآن واحادیث کے بے شمار نشانات اور آثار موجود ہیں ۔ جو کہ ہر ایک کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

زیرِ نظر مضمون میں اختصاراً عرض ہے :۔

وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما افٍ ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریمًا ...... الخ

ترجمہ : اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ہوں نہ کہنا اور انھیں نہ جھڑکنا اور ان کی تعظیم کی بات کہنا اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر کہ اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے بچپن میں پالا ۔　(کنز الایمان)

ضعف کا غلبہ ہو، اعضاء میں قوت نہ رہے اور جیسا کہ بچپن میں ان کے پاس بے طاقت تھا ایسے میں وہ آخری عمر میں تیرے پاس ناتوان رہ جائیں والدین کو اپنی زبان سے ایسا کوئی کلمہ نہ نکالنا چاہیے

کہ انھیں ناگوار معلوم ہو اور حتی الامکان ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کے جائز مطالبات پوری کرنی چاہیے۔ (تفسیر نعیمی)

ایک دوسری جگہ اسی طرح سے خطاب فرمایا گیا ہے:

ان یشکولی ووالدیك : میرا شکر ادا کرو اور والدین کے شکر گزار رہو

والدین کریمین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلق سے احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی سختی کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہے اور ان کے ساتھ نازیبا اور ناروا حرکت کرنے والوں کے سلسلہ میں وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث مبارک شاہد ہے:۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منبر کے قریب آجاؤ۔ ہم لوگ حاضر ہو گئے۔ جب آپ نے منبر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا آمین، پھر جب دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا 'آمین'، پھر جب تیسری سیڑھی پہ قدم مبارک رکھا تو فرمایا "آمین"۔ خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آج ہم نے آپ کی زبان مبارک سے ایسی باتیں سنیں جو پہلے کبھی نہیں سنتے تھے۔ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور انھوں نے یہ دعا کی کہ ہلاک و برباد ہو وہ شخص جو رمضان المبارک کا مہینہ پائے اور پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہو (یعنی مغفرت کرانے کا کام نہ کرے۔) میں نے کہا "آمین"۔ پھر جب دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تو انھوں نے کہا کہ ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر مبارک کیا جائے اور وہ اس پر درود نہ پڑھے۔ میں نے کہا: آمین۔ پھر جب تیسری سیڑھی پر چڑھا تو انھوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے ماں باپ دونوں یا کوئی سا ایک بوڑھے ہو جائیں اور وہ اس شخص کو جنت میں داخل نہ کرائیں (یعنی ان کی خدمت کر کے جنت کا حق دار نہ بن سکے۔) میں نے کہا "آمین!"

اس حدیث میں تین بددعائیں ذکر ہیں وہ بھی فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین ارشاد فرمایا: ہمیں ان بددعاؤں سے بچنا چاہیے۔ اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے احکام کی مکمل طور سے پابندی کرنی چاہیے۔ اس میں والدین کے تعلق سے صریح انداز میں خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جبرئیل امین کی بددعائیں پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا آمین کہنا ثابت ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔ صحابہؓ کرام جنہوں نے عرب کا زمانۂ جاہلیت دیکھا تھا ان کو سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کوئی اپنے ماں باپ کو کوئی کیوں کر گالی دے گا یعنی یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ مراد دوسرے سے گالی دلوانا ہے۔ اور اب وہ زمانہ آیا ہے کہ بعض لوگ خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتے ہیں اور لحاظ نہیں کرتے۔ (بخاری و مسلم)

ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے سرکارؐ سے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا: کہ وہ دونوں بشری جنّت در دوزخ ہیں۔ یعنی ان کو راضی رکھنے میں جنّت ملے گی اور ان کو ناراض رکھنے کے صلہ میں دوزخ کے مستحق ہوں گے۔

ابو داؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ ابو اسید ساعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ بنی سلمہ میں کا ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: کہ یا رسول اللہ! میرے والدین مر چکے ہیں اب ان کے ساتھ احسان کا کوئی طریقہ باقی ہے! فرمایا: ہاں! اُن کے لیے دعا اور استغفار کرنا، اور انھوں نے جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرنا اور جس رشتہ والے کے ساتھ ان ہی کی وجہ سے سلوک کیا جا سکتا ہو اس کے ساتھ سلوک کرنا اور ان کے دوستوں کی عزّت کرنا

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ باپ کا حق اولاد پر۔ (بیہقی)

ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے بیان فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے، تو اس سے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب اس میّت کو صبح قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ ان تین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صالح اولاد اپنے والدین کے لیے خیر کی دعا کرے بلندئ درجات، رحمت و مغفرت کے لیے دست بہ دُعا رہے۔

راقم الحروف کے والدین اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، انھیں کا صلہ ہے کہ آج ناچیز دینی تعلیمات سے بہرہ ور ہوا ہے۔ میں عقیدت و محبت کے پھول والدین کی مرقد پہ نچھاور کرتا ہوں اور رحمت و مغفرت

(بقیہ صفحہ 123 پر ملاحظہ ہو)

دفعِ مضرت

ایم ۔ بی ۔ شیخ فضل اللہ ۔ متعلم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ، ویلور

یہ حقیقت ہے کہ قدرت سے جب زمین کا جگر شق کر کے ایک دانہ سے کونپل پھوٹتی ہے تو اس کا مالک ہر طرح سے اس کی حفاظت کرتا ہے ۔ عموماً اس کونپل کی حفاظت چار قسموں پر مشتمل ہے ۔

۱ ۔ سب سے پہلے موذی جانوروں سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے ۔ کیوں کہ یہ جانوروں کی غذا ہے اگر کوئی جانور اس کونپل کو کھا لے تو اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے ۔

۲ ۔ درخت کے اسبابِ زندگی میں پانی ، ہوا اور دھوپ کی فراہمی بھی ہے ۔

۳ ۔ آفاتِ سماوی سے بچاؤ ۔

۴ ۔ اور مالکِ باغ کے دشمن اور حاسد سے حفاظت ۔

ان چاروں چیزوں سے حفاظت کے بعد اب یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ ورنہ دانوں کو زمین پر بکھیر دینے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا ۔

ٹھیک اسی طرح سے کائنات کے حقیقی و مربی مالک سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے بھی چار چیزوں سے حفاظت لازمی ہے ۔

۱ ۔ شرِ مخلوق ۔ ۲ ۔ شرِ غاسقٍ ۔ ۳ ۔ شرِ نفّٰثٰتِ ۔ ۴ ۔ شرِ حاسد

۱ ۔ شرِ مخلوق خواہ جاندار ہو یا بے جان ، انسان ہو یا حیوان مثلاً شیر ، بھالو ، سانپ ، بچھو وغیرہ جنّ ، پری ، بھوت ، آسیب ، بد نظر اور جادو کے اثرات سے اور بالخصوص شیطان مردود سے کیوں کہ اس سے بڑھ کر مخلوقات میں اور کوئی بدتر مخلوق نہیں ہے ۔ جس طرح آسیب اور نظر بد سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اسی طرح

جھاڑ پھونک اور جادو (سحر) بھی عوام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید بن اعصم یہودی اور اس کی بیٹیوں نے جادو کر دیا تھا، جس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض کی سی حالت پیش آئی۔ آپؐ نے حق تعالیٰ سے دعا کی۔ اس پر یہ "سورۂ فلق" اور "سورۂ ناس" ایک ساتھ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ اس سحر (جادو) کا موقع ومحل بتلا دیا گیا۔ چناں چہ وہاں سے مختلف چیزیں نکلیں۔ مثلاً کھجور کا پھول، آپؐ کی کنگھی اور موئے مبارک وغیرہ تھے جن میں جادو کیا گیا تھا۔ نیز اس میں ایک تانت کا ٹکڑا بھی تھا۔ جس میں گیارہ گرہیں (گھانٹیاں) لگی ہوئی تھیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ دونوں سورتیں پڑھنے لگے ایک ایک گرہ کھل گئی اور آپ کو بالکل شفاء ہو گئی۔

ان دونوں سورتوں (سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس) کی پانچ اور چھ کل گیارہ آیتیں ہیں۔ جن کے مجموعہ میں مختلف شرور سے استعاذہ اور حفاظت کا جہاں سبق ملتا ہے وہیں سب امور میں حق تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم بھی ملتا ہے۔

شرِّ غاسق - اور اندھیری رات کے شر سے۔

حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف نظر کر کے فرمایا: اے عائشہؓ! اللہ کی پناہ مانگ اس کے شر سے یہ اندھیری ڈالنے والا ہے۔ جب یہ ڈوبے یعنی آخر ماہ میں جب شب تاریک یا شب دیجور بھی کہتے۔ جس میں چاند نظر نہیں آتا تو یہی رات ساحروں (جادوگروں) کے نزدیک زیادہ اہمیت والی اور ان کے عمل کو زیادہ موثر بنانے والی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چناں چہ اسی لیے اس سے بچنے اور پناہ مانگنے کی ہمیں ہمارے پروردگار نے تعلیم دی ہے۔

یہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہو گئی کہ چاند گرہن ہو یا سورج گرہن یہ دونوں بھی شرِ غاسق (اندھیری رات) کی قسم سے ہی تعلق رکھنے والے ہیں۔ جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ اندھیری رات کو زائل فرماتے ہیں اسی طرح یہ چاند و سورج گرہن کو بھی زائل فرما دیتے ہیں۔ اور جس طرح رات کی تاریکی کو دور فرمانے والے ہیں حق تعالیٰ ٹھیک اسی طرح سے اثر لیل یعنی سحر کا بھی اثر وہی ہٹانے والے ہیں۔

غرض یہ چاند و سورج کی تابانی یا تاریکی، دن کی روشنی یا رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی اور اندھیری اور ساحروں کی جھاڑ پھونک اور جادوگری وغیرہ فی نفسہٖ نہ تو کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ نافع وضار تو صرف اللہ کی ذات ہے اور بس! یہی سبق ان دو سورتوں سے ہمیں ملتا ہے۔ سچ ہے: ؎

ان پر نگاہیں تیری یہ اٹھتی ہیں آج کیوں؟ واللہ جن کے ہاتھ میں نفع وضرر نہیں

شرِّ نفّٰثٰت: ان عورتوں کے شر سے جو گنڈے کے گرہوں پر جادو کے منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہیں۔ جیسے لبید بن اعصم یہودی کی لڑکیوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

پر جادو کیا تھا۔

شر حاسد : حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔ حسد کیا چیز ہے ؟ یہ پہلے جان لینا چاہئیے سو اس کے متعلق عرض ہے کہ حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے دنیوی یا اُخروی کمال کے زوال کی تمنّا کرنا حسد ہے۔ اور یہ ناجائز ہے بلکہ حرام ہے۔ مثلاً کسی دولت مند کو دیکھ کر یہ خواہش کرنا کہ کاش اس کی یہ دولت ختم ہو جائے یا کسی خوش الحان قاری قرآن کی آواز کو سن کر یہ تمنّا کرنا کہ کاش! اسکی یہ آواز بدل جائے یا بیٹھ جائے۔ یا کسی کی شہرت و عزّت کو دیکھ کر یہ فکر کرنا کہ کسی طرح اس کی شہرت پر دھبّہ لگے یہی ہے حسد اور یہ مذموم ہے بُرا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے شریعت نے مطلوب اور محبوب گردانا ہے۔ اور وہ ہے رشک اور غبطہ اور یہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے واقعات میں بکثرت ملتا ہے۔ اور وہ کسی کے کمال کے زوال کی تمنّا نہیں کرتے بلکہ وہ ایسی خواہش کرتے تھے کہ کاش ہم بھی اس جیسے عابدِ شب بیدار بن جاتے اور کاش اس ثواب میں ہم بھی اس کے شریک وسہیم ہوتے اور اس جیسی دولتِ تقویٰ سے مالا مال ہوتے۔ یہ چیز جائز ہے اور شریعت نے اس کی تمنّا کرنے کی اجازت دی ہے۔ آج بھی اگر ہم کسی خوش حال مال دار کو دیکھ کر یہ تمنّا کریں کہ کاش ہمیں بھی ایسی دولت مل جائے تو کیا اچھّا ہوگا۔ یا کسی عالم کو دیکھ کر اور اس کی شہرت کو دیکھتے ہوے دل میں یہ خواہش پیدا ہو نا کہ کاش! ہماری اولاد بھی اس جیسی ہو جائے تو یہ بُرا نہیں ہے۔ یہی رشک اور غبطہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ "سورۂ فلق" کی آیت ومن شرحاسد اذا حسد کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آسمان وزمین پر جو پہلا گناہ ہوا وہ حسد ہی کی وجہ سے تھا۔ وہاں آسمان پر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا تھا، یہاں زمین پر قابیل نے ہابیل پر"

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدمؑ کو سجدہ کرو تمام فرشتے سجدہ ریز ہو گئے لیکن معلم الملکوت نے سجدہ سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں آگ سے بنا ہوا ہوں اور یہ مٹی سے تو میری حیا نہیں قبولتی کہ اپنے سے کم تر کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ؟

قابیل کا حسد یہ تھا کہ حضرت حوّاؑ کے ایک حمل میں ایک لڑکا ایک لڑکی پیدا ہوتی اور ایک حمل کے لڑکے کا دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ نکاح کیا جاتا تھا اسی دستور کے مطابق آدم علیہ السلام نے قابیل کا نکاح لیودا سے سے جو ہابیل کے ساتھ پیدا ہوی تھی اور ہابیل کا نکاح اقلیما سے جو قابیل کے ساتھ پیدا ہوی تھی کرنا چاہا قابیل اس پر راضی نہ ہوا۔ چوں کہ اقلیما زیادہ خوب صورت تھی اس لیے اس کا طلب گار رہا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تیرے ساتھ پیدا ہوی ہے لہذا وہ تیری بہن ہوئی اس کے ساتھ تیرا نکاح حلال

نہیں ہے۔ کہنے لگا یہ تو آپ کی رائے ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم دونوں قربانیاں پیش کرو۔ جس کی قربانی مقبول ہوگی وہی اقلیما کا حق دار ہوگا۔ اس زمانہ میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ اتر کر اس کو کھا لیا کرتی۔ چنانچہ قابیل نے ایک انبار گندم اور ہابیل نے ایک بکری قربانی کے لیے پیش کی۔ آسمانی آگ نے ہابیل کی قربانی لے لی اور قابیل کی گیہوں چھوڑ دی۔ اس پر قابیل کے دل میں بہت ہی بغض و حسد پیدا ہوا۔

یہاں تک کہ قابیل نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام حج کرنے کی غرض سے مکہ شریف گئے ہوئے تھے ہابیل نے کہا کہ کیوں بھائی میرا کیا قصور ہے تو قابیل نے کہا کہ تمہاری قربانی مقبول ہوی اور اقلیما کے مستحق ٹھہرے اس میں میری ذلت ہے تو قابیل کہنے لگا: اللہ متقیوں کی قربانی قبول فرماتا ہے۔ اگر تم بھی متقی ہوتے تو تمہاری قربانی بھی قبول ہوتی۔ یہ تو تمہارے کیئے اور افعال کی برائی ہے۔ اس میں میرا کیا جرم ہے؟ تو قابیل نے اپنی خواہش کی خاطر ہابیل کو قتل کر ڈالا۔

بہر حال حسد ایک ایسا بدترین گناہ ہے جو تمام برائیوں کا مبدأ اور جڑ ہے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے: الحسد یأکل الحسنات کما یأکل النار الحطب: یعنی حسد تمام نیکیوں کو کھا لیتا ہے جس طرح کہ آگ لکڑی کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق دے اور حسد کرنے سے بچنے کی ہمت و طاقت عطا کرے۔ آمین ••

بقیہ ص: نمبر 130 کا: "محمود و ایاز"

پسند فرماتے کہ میں بندہ ہوں اور غلاموں کی طرح بیٹھ کر کھانا پسند کرتا ہوں۔ غرض یہ کہ آپ کے ہر ہر فعل سے اظہار بندگی عیاں تھا۔ حضورؐ کے اسی اسوۂ کی پیروی میں صوفیائے کرام نے بھی اپنی زندگیاں گزار دیں اور اپنی جانوں پر بے انتہا سختیاں اٹھائیں۔ صوفیائے کرام کے ایسے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اور چیدہ چیدہ واقعات ہر خاص و عام کی زبانوں پر ہیں۔

نیکیاں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور برائیاں تیرے نفس کی طرف سے۔

آقا ہمیشہ آقا رہے گا اور بندہ ہمیشہ بندہ رہے گا۔ بندہ لاکھ ترقی کرے آقا نہیں بن سکتا آقا کی نسبت بندہ کے لیے افضل ترین مقام بندگی ہی ہے۔ ❖

اذان کی مشروعیت کا تاریخی پس منظر

قاری سید شاہ محمد جمال اللہ بادشاہ قادری، متعلم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

یہ حقیقت ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں یہود و نصاریٰ کی تعلیمات اور بت پرستی عام ہو چکی تھی۔ بت پرست جن کے گھر گھر میں ایک ایک بت اور خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔ ان کی پوجا پاٹ کی خاطر لوگوں کو جمع کرنے کا جو ذریعہ تھا وہ یا تو ڈھول تاشے بجا کر پورا کیا جاتا تھا یا ناقوس اور قرنا پھونک کر۔ غرض ان آوازوں پر لوگ حاضر ہوا کرتے اور اپنی عبادت کیا کرتے تھے۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور اشاعتِ اسلام کا حکم ہوا تو آپؐ نے جس طرح قبلِ نبوت غارِ حرا میں عبادت کی اسی طرح نبوت کے بعد بھی انفرادی طور پر عبادت کی۔ نبوت کے دسویں سال جب سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رجب کی ۲۷ ویں رات میں معراج ہوئی تو انعام کے طور پر (۵۰) پچاس نمازیں دن اور رات میں فرض ہوئیں تو اس مقدار کو گھٹانے کی خاطر سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نو (۹) بار بارگاہِ الٰہی میں حاضری دی اور بالآخر یہ پانچ (۵) نمازیں فرض ہوئیں۔

اور یہ نماز مکہ معظمہ میں قیام کے دوران الگ الگ اپنے اپنے گھروں میں پڑھی جاتی تھیں اور کبھی بیت ارقم میں۔

مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار دن قبا میں قیام فرمایا اور یہیں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جو آج بھی مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے۔

سنہ ۱ھ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو وہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ ویسے ہی جہاں موقع ملتا اور وقت ہو جاتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ پھر جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے مسجد بنوانے کا حکم فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی نجار سے مسجد کی جگہ خریدی۔ وہ لوگ آپؐ کے جانثاروں میں سے تھے۔ انہوں نے مفت دینا چاہا رقم لینا گوارا نہیں کیا مگر حضورؐ نے ان کی غربت دیکھتے ہوئے جگہ کی قیمت مقرر فرمائی اور دس دینار معاوضہ طے ہوا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قسمت میں یہ نعمت لکھی تھی۔

چناں چہ انہوں نے یہ رقم ادا کی۔ پھر مسجد تعمیر ہوی۔ اب مسجد تو بن گئی مگر نمازیوں کو بلانے کا کوئی طریقہ یا علامت سمجھ میں نہیں آئی۔ اندازے سے لوگ آجاتے تھے۔ اب کسی کی جماعت فوت ہوگئی تو سخت صدمہ پہونچتا تھا۔ کیوں کہ وہاں کوئی جماعتِ ثانیہ نہیں ہوتی تھی۔ سب اسی فکر میں تھے کہ لوگوں کو بلانے کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کیا جائے جس سے سب آسانی سے جمع ہوسکیں۔

غرض آپس میں مشورہ ہوا۔ کسی نے کہا کہ مجوسیوں کی طرح آگ جلایا کرو۔ اس کو دیکھ کر لوگ سمجھ جائیں گے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اور وہ جلدی سے آجائیں گے۔ کسی نے کہا کہ نصاریٰ کی طرح ناقوس بجایا کرو، کسی نے کہا کہ یہود کی طرح قرن (سنگھ) پھونکا کرو۔ مگر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشوروں کو پسند نہیں فرمایا۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا کہ نماز کے وقت ایک شخص کھڑا ہو کر الصلوٰۃ الصلوٰۃ پکار دیا کرے۔ یہ رائے پسند ہوی۔ اسی پر عمل ہونے لگا۔ مگر پھر بھی کسی عمدہ اور اس سے بہتر تدبیر کی فکر دامن گیر رہی۔

حضرت عبداللہ بن زید صحابی رضی اللہ عنہٗ نے ایک رات 'ہرے لباس میں ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔ (جو درحقیقت خدا کا فرشتہ تھا) اور وہ ناقوس رکھا تھا۔ (ایک لکڑی کو دوسری لکڑی پہ مار کر آواز نکالنے کو ناقوس کہتے ہیں۔) انہوں نے پوچھا: "کیا اس کو فروخت کرتے ہو؟"

ہرے لباس والا آدمی: تم کیا کروگے اس کو لے کر؟

حضرت عبداللہ : نماز کے اوقات میں اس کو بجاکر لوگوں کو بلایا کروں گا۔

ہرے لباس والا آدمی: ستو ہم تمہیں اس سے بھی بہتر ترکیب بتلاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ : جی ہاں! ضرور بتلاؤ

چناں چہ (ہرے لباس والے) فرشتہ نے یہی اذان کہہ کر سنائی۔ جو آج کل پانچوں وقت پکاری جاتی ہے۔ اور پھر کہا، تم نماز کے وقت ہمیشہ ایسا ہی پکار دیا کرو۔

صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن زیدؓ اسی وقت نیند سے بیدار ہوئے اور رات ہی کے وقت اٹھ کر سیدھے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دروازے پہ دستک دی۔ آپؐ نے اندر بلا لیا۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ اور ادھر وحی کے ذریعہ خواب کی تائید بھی ہوگئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارا خواب بالکل سچّا ہے اور نہایت مبارک ہے اور برحق ہے۔ جاؤ تم اور بلالؓ مسجد میں ہے بلالؓ کی آواز اونچی ہے۔ تم انہیں بتلاتے جاؤ اور وہ اسی مطابق پکارتے جائیں۔

چناں چہ ادھر اذان پکاری گئی۔ اُدھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جلدی سے دوڑتے ہوئے

اس حالت میں آئے کہ چادر ان کی زمین سے گھسٹتی ہوی جاتی تھی ۔ عرض کیا کہ : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قسم خدا کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے ۔ آج رات میں نے اسی طرح کا خواب دیکھا ہے اور یہی الفاظ سُنے ہیں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کہ الحمد للہ ! مگر عبد اللہ تم سے آگے ہو گئے ۔ اور تم سے پہلے انھوں نے اس کی اطلاع دے دی ۔

اس طرح حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہٗ کے خواب کی تصدیق بذریعہ وحی فرمادی اور ہمیشہ کے لیے اسی پر عمل ہونے لگا ۔ اور حضرت عبد اللہ کو بے انتہا خوشی ہوی اور اس خوشی میں انہوں نے بہت سے اشعار خدا کی حمد میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اظہارِ شکر کے طور پر کہے ۔

ترمذی شریف میں ہے کہ جب اذان جاری ہوی تو پانچوں وقت ایک ہی طرح کے الفاظ موجود تھے ۔ ایک دن صبح کو حضرت بلال رضی اللہ عنہٗ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز کے لیے بلانے آئے تو آپ آرام میں تھے ۔ حضرت بلال رضؓ نے آواز دینے کو گستاخی سمجھا اس لیے الصلوۃ خیر من النوم کہا ۔ حضورؐ بیدار ہو گئے اور فرمایا : اے بلال رضؓ ! یہ تو بہت ہی اچھا کلمہ ہے اس کو صبح کی اذان میں شامل کر لو ۔ اور کہا کرو ۔ اس طرح ان دو کلموں کا اضافہ بھی ہو گیا اور قیامت تک کے لیے جاری کر دیا گیا ۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام نے مصر میں قحط کے زمانہ میں غلّہ کی تقسیم کا بہترین انتظام فرمایا تھا ۔ متوسط طبقہ کو قیمت پر محتاجوں اور غریبوں کو مفت غلّہ دلواتے تھے ۔ ایک دن ایک شخص کے سوال پر غلّہ دلوایا ۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی سوالی بن کر آیا ۔ آپ نے کچھ دیدیا ۔ تیسری مرتبہ پھر آیا تو آپؑ نے فرمایا : اے خدا کے بندے خیال تو کر کس قدر گرانی ہے اور لوگوں کو کس درجہ پریشانی ہے ۔ دوبار لے چکا شرم نہیں آتی پھر آ گیا ۔

اس نے عرض کیا اگر میرا حال آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ میرا سوال رد نہیں کریں گے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا حال دریافت کیا : اس نے کہا کہ میں وہی لڑکا ہوں جس نے اپنی شیر خواری کی حالت آپ کی عصمت و پاک دامنی کی گواہی دی تھی (کہ یوسفؑ کی قمیص کو دیکھو اگر وہ سامنے پھٹی ہے تو یوسفؑ کی خطا ہے ۔ زلیخا سچّی ہے اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا جھوٹی ہے اور یوسفؑ سچّا ہے ۔) اب میں جوان ہو گیا ہوں اور اپنی غربت و افلاس سے مجبور ہو کر آپ کے آگے دستِ سوال دراز کر دیا ہوں ۔

یہ سن کر حضرت علیہ السلام بہت خوش ہوئے اور اس کو منوں غلّہ اور بہت سا مال نقد عطا کر کے انعام و اکرام اور پوری عزّت و احترام سے لوٹایا ۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یہ دریافت فرمایا : [بقیہ صفحہ ۱۱۹ پر ملاحظہ فرمائیں]

فضائلِ درود

صابر احمد بلگام: متعلم: دار العلوم لطیفیہ: حضرت مکان: ویلور

فلک کے چاند تاروں سے کوئی پوچھے مقام اُن کا
تجلّی ہی تجلّی ہے جہاں لکھا ہے نام اُن کا

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نورِ خداوندی ہیں اور باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ عرش و کرسی، لوح و قلم، جنّت دوزخ، چاند سورج آپؐ ہی کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رفعت کا کیا کہنا خود خداوندے تعالیٰ فرماتا ہے ورفعنا لك ذكرك روئے زمین پہ پانچوں وقت اذانوں میں خدا کے نام کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک بھی لیا جاتا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

تمہارے نام کو اللہ سے ایک خاص نسبت ہے
اذانوں میں، نمازوں میں جہاں وہ ہے وہیں تم ہو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک بھی عبادت ہے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاء کرام کا ذکر کرنا عبادت ہے، صالحین کا ذکر کرنا گناہوں کے لیے کفّارہ ہے اور موت کا ذکر کرنا صدقہ ہے، قبر کی یاد تم کو جنّت تک پہنچا دیگی (جامع صغیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک سے دوزخ کی آگ سرد پڑ جائے گی:

روایت ہے کہ قیامت کے دن قرآن کے حافظوں کی ایک جماعت دوزخ میں داخل ہوگی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک فراموش

کر چکے ہوں گے ۔ دوزخ کی آگ انھیں جلادی ہوگی ۔ پھر اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی یاد دلائیں گے تو وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیں گے پھر آپ کے نام مبارک کی برکت سے دوزخ کی آگ سرد ہو جائے گی اور وہ لوگ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے

(مواہب الدنیہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام جہنم میں داخل نہ ہوگا :

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن دو آدمی دربارِ خداوندی میں پیش ہوں گے حکم ہوگا ان کو جنت میں لے جاؤ ۔ یہ حکم سنتے ہی خود ان دونوں کو تشویش ہوگی اور حیرت و استعجاب کے عالم میں بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں یا اللہ العالمین ہم پوری طرح مایوس ہو چکے تھے ۔ ہمارے پاس ایسا کوئی عمل نہیں تھا جس کی وجہ ہم جنت میں جا سکیں ۔ لہذا ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر ہمارے کس عمل کی خاطر آپ ہم پر اس قدر مہربان ہو گئے ۔ اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ۔ تم جنت میں جاؤ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جس شخص کا نام میرے حبیبؐ کے نام سے ملا ہوگا یعنی محمدؐ یا احمدؐ ہوگا اس کو دوزخ میں داخل نہیں کروں گا ۔

(مواہب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک تمام ملاءِ اعلیٰ میں مرقوم ہے :

حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت شیث علیہ السلام سے فرمایا : اے جانِ پدر! تو میرے بعد خلیفہ ہوگا ۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنے اوپر لازم کر لینا ۔ اور جب خدا کا ذکر کرو تو اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کرنا ۔ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک عرشِ الٰہی پر لکھا ہوا دیکھا ہے ۔ ساتوں آسمانوں میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں حضورؐ کا نام مبارک نہ لکھا ہوا ہو ۔ جنت کے ہر مکان کی ہر منزل پر اور جنت درختوں کے تمام پتوں پر، سدرۃ المنتہیٰ کے ہر ہر پتے پر اور جنت کی حوروں کی گردنوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لکھا ہوا ہے ۔ فرشتوں کے چہروں پر دونوں آنکھوں کے درمیان حضورؐ کا نام مبارک لکھا موجود ہے ۔ آسمان کے تمام فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک کرتے رہتے ہیں ۔

(مواہب)

حضرت آدم علیہ السلام کی وحشت حضور صلعم کا نامِ مبارک سُن کر دُور ہوی :

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ

سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنّت سے زمین پہ اتارے گئے تو انہیں تنہائی اور اس دوسرے عالم میں پہنچنے سے سخت وحشت و پریشانی لاحق ہوئی۔ انہوں نے بارگاہ ایزدی میں اپنا حال بیان کیا۔ اس پر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام جو زمین پہ جلوہ افروز ہوتے ہیں اور بلند آواز سے یہ کلمات ارشاد فرماتے ہیں:

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ: چناں چہ ان مقدّس الفاظ کو سُن کر حضرت آدم علیہ السلام کی وحشت دور ہوئی اور قلبی سکون نصیب ہوا۔ (المواہب)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن بُراق پہ سوار ہوں گے:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن انبیائے کرام علیہم السلام چوپاؤں پر سوار ہوں گے اور میں براق پہ سوار ہوں گا۔ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) جنّت کی ایک اونٹنی پہ سوار ہوں گے اور میدانِ حشر میں اذان دیں گے۔ وہ جس وقت اشھد ان محمداً رسول اللہ کہیں گے تو اوّلین و آخرین کے تمام مومنین اس کی شہادت اور گواہی دیں گے کہ انّ محمداً رسول اللہ (بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں)۔ (المواہب)

قبر میں سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال ہوگا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم کثرت کے ساتھ درود پڑھا کرو۔ قبر میں سب سے پہلے تم سے میرے بارے میں ہی سوال کیا جائے گا۔ (رواہ البخاری۔ ابن عساکر)

درود وسلام پڑھنے والے پہ خدائے تعالیٰ بھی درود وسلام بھیجتے ہیں:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام نے مجھے اس کی بشارت دی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود بھیجے میں بھی اس پہ درود بھیجوں گا اور جو آپؐ پہ سلام بھیجے ہیں میں اس پہ سلام بھیجوں گا۔ (رواہ احمد و حاکم)

درود شریف پڑھنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں:

حضرت امام حسین علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ درود شریف کثرت سے پڑھا کرو کیوں کہ درود شریف پڑھنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ (ابن عساکر)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک کا ادب و تعظیم کی برکت:

حضرت وہب بن منبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بڑا ہی خطا کار و نافرمان تھا۔ ننّو سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ لوگوں نے اس کی نعش کو ایک گندی جگہ میں جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہو دیا دیا۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جاؤ اس میت کو کوڑے سے نکالو اور نماز جنازہ پڑھ کر کسی پاک جگہ دفنا دو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! بنی اسرائیل شاہد ہیں کہ وہ بندہ نہایت ہی بدکار، سیہ کار اور آپ کا نافرمان تھا۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں! بے شک تم نے ٹھیک کہا لیکن مجھے اس کی ایک ادا پسند آگئی ہے وہ یہ کہ جب کبھی بھی وہ توراۃ شریف کو کھولتا تھا اور اس کی نظر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی و اسم گرامی پر پڑتی تھی تو وہ حضورؐ کے نام مبارک کو چومتا، بوسہ دیتا اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا پسند آگئی ہے۔ اس لیے میں نے اسے محض اپنے فضل و کرم کے طفیل بخش دیا ہے اور جنت میں ستّر حوریں بھی عطا کر دی ہیں۔

(حلیہ ابن نعیم)

یہ چند احادیث جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک اور درود شریف کے فضائل اور متعلق "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر زیبِ قرطاس کر دیا ہے عمل کے لیے تو بس یہی کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام قارئین حضرات کو اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

بسم اللہ　　　　هو الباقی

قطعہ تاریخ وفات اعلیحضرت ابو النصر قطب الدین سیّد شاہ محمد باقر قادری قدس سرہٗ

آلِ پاکِ پیشوائے مرسلاں
بست چوں رفت سفر سوئے جناں
کلکِ من سالِ وفاتش زد رقم
غایب قطبِ دینِ مقبولِ جہاں

۱۴۱۵ھ

از قلم بدر جمالی مدراس

پیشکش از حافظ محمد بدرالدین شہر قاضی لطیفی ویلور

تاریخ اسلام کا ایک انوکھا ورق

حافظ قاری سید اشرف علی ۔ملباگلی ۔ متعلم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ، ویلور

حضرت امیر المومنین عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو پانچویں خلیفۂ راشد اور عمر ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔کیوں کہ آپ کے دورِ خلافت میں اسلامی شریعت اور عدل وانصاف اور رعایا پروری کا پھر سے بول بالا ہوا ، جس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا امارت وحکومت جن کو ورثے میں ملی تھی یہ وہی عمر تھے جن کو شاہی خاندان میں آنکھ کھولنے پھلنے پھولنے ، پروان چڑھنے کا شرف حاصل تھا ۔ شاہی ناز ونعم میں پلے اس فرزندِ عظیم کے ناتوان کندھوں پہ جب ملّتِ اسلامیہ کی امارت وخلافت کا بارِ گراں رکھا گیا تو ان کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا ۔ آپ یکسر بدل گئے ۔ عمدہ سے عمدہ نفیس سے نفیس لباس زیبِ تن کرکے کھردرا پن محسوس کرنے والے بالکل سادا لباس پہننے پہ اُتر آئے ۔ آپ کے جسم پہ اتنا سادا لباس ہوتا تھا کہ ایک عام آدمی اور ایک خلیفۂ وقت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا ۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ ایک دن امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز بالکل سادا سیدھا لباس زیبِ تن کئے ہوئے اپنے دولت کدہ پہ تشریف فرما تھے کہ آپ کی اہلیۂ محترمہ فاطمہ بنتِ عبدالملک قیمتی اور ریشمی لباس جو تراش خراش اور چمک دمک میں اپنی مثال آپ تھا پہنے ہوئے زر وجواہر سے جڑے ہوئے زیورات سے آراستہ ہوکر اپنے مجازی خدا کے سامنے حاضر ہوئیں ۔ فاطمہ جہاں ایک خلیفہ کی دختر تھیں وہیں خلیفۂ وقت کی شریکِ حیات بھی تھیں ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی زوجۂ محترمہ پہ ایک محبت پاش نظر ڈالی ، مسکرایا اور یوں گویا ہوئے : فاطمہ ! تمہارا یہ قیمتی لباسِ فاخرہ اور یہ بیش قیمت زیورات ، جن کی چمک

دمک نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ واقعی تم ان کی حقیقی حق دار ہو اور تمہارے علاوہ اور کون ان سب کا حق دار ہو سکتا ہے! میرا اپنا خیال ہے کہ شاید یہ سب تم کو تمہارے والد بزرگوار سے ملا ہوگا۔

فاطمہ نے فرمایا: امیر المومنین کا خیال درست ہے۔

اپنی اہلیہ کا یہ جواب سن کر آپ نے ارشاد فرمایا:

فاطمہ سُن لو! آج کا یہ دن ہمارے لیے فیصلہ کا دن ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب تم کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ جب کہ اے فاطمہ! یہ زیورات اور کپڑے نہ تمہارے ہیں، نہ میرے اور نہ تمہارے باپ کے، یہ وہی چیزیں ہیں جو بیت المال سے تیار کئے گئے ہیں۔ درحقیقت ان پر تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ان چیزوں کی موجودگی میں تمہارا اور میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔ یا تو تم ان سب کو بیت المال میں داخل کرا دو یا مجھے چھوڑ دو۔

جب اپنے سرتاج کی زبان سے اتنی سیدھی اور سچی اور حقیقت آمیز بات سنی تو سعادت مند، فرماں بردار بیوی کے چہرے پر ایک رمق برابر شکن تک نہیں آئی بلکہ چہرہ مارے خوشی کے کھل اٹھا اور کہنے لگیں:

اے امیر المومنین! آپ کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ یہ زیورات اور کپڑے، ہیچ ہیں۔ آپ کی رضامندی اور خوشنودی ہی میرے لیے اصلی زیور اور ملبوسات ہیں اور سچی خوشی اور سعادتِ دارین کی ضامن ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں ابھی بیت المال کے داروغہ کے پاس بھجوا دیتی ہوں۔ جس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ تھیں زمانۂ سلف کی بیویاں جو اپنے مجازی خدا کی خوشنودی اور رضامندی اور دینِ اسلام کے احکام پر عمل کرنا اپنا ایمان سمجھتی تھیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ••

(بقیہ 113 کا "اذان کی مشروعیت کا تاریخی پس منظر")

کہ اے یوسف (علیہ السلام) جس نے ایک دفعہ تمہاری پاک دامنی کی گواہی دی تم نے اس کو اس قدر انعام واکرام سے نوازا اور جو شخص ہر روز ہماری توحید کی شہادت اور گواہی دے اس کو ہم کس قدر نوازیں گے؟ کیا کبھی اس پر بھی سوچا ہے؟ کیوں کہ ہم سب سے زیادہ سب سے بڑھ کر سخی اور مہربان ہیں۔ اب یہ اندازہ کرو جو مؤذن پانچوں وقت خدائے ذوالجلال کی بڑائی اور توحید کی گواہی دے رہا ہے اس پر اللہ پاک کی کس قدر رحمت بے پایاں اور عنایت بے بہا ہوگی۔؟ ••

سلام و دعا

سیّد تنویر الزماں۔ ویلوری ۔ متعلم دارالعلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان ۔ ویلوری

دنیا کی ہر قوم و مذہب میں سلام کا عام رواج ہے۔ جب آپس میں ملاقات ہو تو کسی ایسے کلمے کے ساتھ بات کی ابتدا کی جائے جس میں محبت و شفقت کی مٹھاس موجود ہو۔ چناں چہ جب ہم ان تمام مذاہب کے سلام و پیام کا موازنہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں ہے۔ چوں کہ اسلامی سلام میں محض اظہارِ محبت ہی نہیں بلکہ دعائے صحت اور دعائے رحمت و مغفرت بھی ہے اور ادائے حقِ محبت کا اظہار بھی کہ اللہ تعالےٰ سے یہ دُعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات و آلام سے سلامت رکھے۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دعا بھی نہ صرف دوروزہ زندگی کی بقا و حیات کے لیے ہے۔ بلکہ حیاتِ طیبہ یعنی حیاتِ جاوداں کے لیے بھی کی گئی ہے۔ یعنی جملہ آفات و بلیاتِ دُنیوی و اخروی سے محفوظ رہنے کے لیے کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اسی سے مانگتے ہیں اور اسی کے رحم و کرم پہ ہمارا دار و مدار ہے۔ اس حیثیت سے اس کلمہ کو کلمۂ رحمت بھی کہئے اور کلمۂ عبادت بھی کہ جس کے ذریعہ سے اپنے ایک مسلمان بھائی کو خدائے تعالےٰ کی وحدانیت اور رحمانیت کا سبق یاد دلایا جاتا ہے۔ قرآن پاک کا ہمہ گیر آفاقی پیغام نہ صرف مسلمانوں کے حق میں بلکہ اپنے دیگر غیر مسلم بھائیوں کے لیے بھی نسخۂ اکسیر کیمیا تاثیر ہے۔ آج بھی اس کا یہ ہمہ گیری پیغام پورے ادعیان و مذاہبِ عالم کے لیے یکساں مفید و بے نظیر ہے۔

چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے: وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا۔ (سورۃ النساء)

اور جب تمہیں کوئی کسی لفظ سے سلام کرے تو، تم اس سے بہتر لفظ جواب میں کہو یا وہی کہہ دو۔ بے شک اللہ ہر چیز پہ حساب لینے والا ہے۔ (کنزالایمان)

احکام القرآن میں امام ابن عیینہ فرماتے ہیں: کہ
"تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو۔
سلام عربی لفظ ہے اور اس کے چند معنی ہیں۔ سلامتی، دعا، امن، امان، سالم، تسلیم بندگی، آداب وغیرہ
جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی سلامتی اور بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہم انس و پیار اور محبت و ملاپ کا اظہار ہوتا ہے۔
جنّت کے ناموں میں سے ایک دارالسّلام بھی ہے۔ وہاں داخل ہونے کے بعد لوگ تمام آفتوں، پریشانیوں، برائیوں، مصیبتوں، عیبوں سے اور آپس کی دشمنیوں سے محفوظ رہیں گے
ایک قول یہ بھی ہے کہ جنّت کو دارالسّلام اس لیے بھی کہا گیا ہے کہ وہاں جنّت والے ایک دوسرے سے خلوص اور محبت رکھیں گے اور اس کو ظاہر کرنے کے لیے بار بار سلام کریں گے بلکہ فرشتے اور خود اللہ تعالیٰ بھی جنّت والوں کو سلام کریں گے۔
حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے۔ اس لیے تم آپس میں سلام کو عام کرو۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لاتدخلون الجنة حتى تؤمنوا ولا تؤمنوا حتى تحابوا ولا ادلكم على شيء اذا فعلتموه تحاببتم افشوا السلام بينكم۔ (مسلم)
تم جنّت میں تب ہی داخل ہوں گے جب کہ تم کامل مومن ہو اور کامل مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو اور آپس میں محبت کیسے پیدا ہوگی اس کا راز میں تمہیں بتلاتا ہوں سنو! وہ یہ کہ ایک دوسرے کو سلام کرو اور اس کو خوب پھیلاؤ۔

سلام اور اس کے آداب سے متعلق چند احادیث:

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہو کر سلام کیا: السّلام علیکم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اسے دس نیکیاں ملیں۔ پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے یوں سلام کیا: السّلامُ علیکم ورحمة الله! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا

جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اسے بیس۲۰ نیکیاں ملیں۔ اتنے میں تیسرا شخص آیا اور اس نے اس طرح سلام کیا السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا اور فرمایا اسے تیس۳۰ نیکیاں ملیں۔ پھر چوتھے شخص نے حاضری دی اور سلام کیا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ومغفرتہٗ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اسے چالیس۴۰ نیکیاں ملیں۔ (ترمذی: ابوداؤد)

حضرت طفیل بن ابی بن کعبؓ تابعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم مجھے ساتھ لے کر روزانہ صبح بازار جاتے اور وہاں جو بھی چھوٹا بڑا دکان دار اور امیر و غریب ملتا سب کو سلام کرتے اور واپس ہو جاتے۔ کبھی کسی دکان پر نہ رکنا ہوا نہ سامان خریدنا پڑا۔ راوی حدیث حضرت طفیل رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ حسب معمول ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے مجھ سے کہا کہ چلو! بازار چلیں۔ میں نے عرض کیا کہ: آپؓ اسی طرح سے روزانہ بازار جاتے ہیں، آپؓ کا کام کیا ہے؟ آپؓ نہ کسی دوکان پر رکتے ہیں، نہ کوئی سامان خریدتے ہیں، نہ کوئی بھاؤ تاؤ ہوتا ہے اور نہ بازار کی کسی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پھر آپ بازار جا کر کیا کریں گے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بازار اس لیے جاتا ہوں کہ وہاں جو بھی ملے اُسے سلام کر سکوں۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا یہ مبارک اقدام ہمارے لیے راہ بر کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک سبق آموز واقعہ ہے کہ بازار میں جتنے لوگ اور جس قسم کے لوگ ملیں گے کسی اور جگہ کہاں ملیں گے۔ سماج کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو سلام کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے میں سبقت لے جانا یہ السابقون الاولون من المھاجرین والانصار کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔

سلام کے مسائل :-

۱۔ سلام کے الفاظ میں عموماً غفلت برتنے لگے ہیں اور "سلام علیکم" یہی عام طور پر کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ صحیح طور پر السَّلامُ علیکم ورحمۃ اللہِ وبرکاتُہٗ کہنا ہے۔ ہمزہ (الف) کو خوب ظاہر کر کے ادا کرنا ہے۔

۲۔ سلام میں پہلو تہی نہیں برتنا ہے بلکہ سبقت لے جانا ہے۔ اگرچہ کہ اپنے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو

۳۔ دُور ہونے کی صورت میں الفاظ کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے بھی اشارہ کرے۔ قریب سے بغیر ہاتھ اٹھائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! کہے۔

۴۔ سوار چلنے والے پر، چلنے والا کھڑے رہنے والے پر، کھڑا رہنے والا بیٹھے ہوئے پر سلام کرے۔

۵۔ نفسِ سلام سنّت ہے، لیکن اس کا جواب دینا واجب ہے۔ اس لیے اگر کسی نے جواب دینے میں کوتاہی کی تو سمجھو وہ گنہ گار ہوا۔

۶۔ مجلس میں چند آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو آنے والے نے سلام کیا تو سب کو جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ مجلس میں کسی ایک نے بھی جواب دیا تو سب کی طرف سے اس کا جواب ہوگیا اور اگر کسی نے بھی جواب نہیں دیا تو سب گنہ گار ہوں گے۔

۷۔ آداب عرض ہے، سلام وتسلیم، تسلیمات وتحیات یہ سب الفاظ نئے اور خود ساختہ ہیں اور روزمرّہ کی تہذیب وتمدن سے متعلق ہیں۔ اسلام نے ہمیں خالص السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کے الفاظ کی تعلیم دی ہے اور یہی روحِ شریعت ہے۔

۸۔ مسلمان آپس میں تو ان ہی الفاظ سے اپنی بات چیت کا آغاز کریں گے۔ لیکن جب کسی غیر مسلم سے ملنے جلنے کا موقعہ ملے تو اس کے لیے یہ دعائے صحت و مغفرت نہیں دی جائے گی بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ انھیں صرف سلام سلام یا آداب وغیرہ لفظوں سے یاد کریں گے۔

۹۔ وضو، نماز اور تلاوت میں مشغول آدمی کو سلام نہ کیا جائے۔

۱۰۔ تلاوتِ کلام پاک کرنے والے پر سلام کا جواب نہیں ہے۔ ••

[بقیہ صفحہ ۱۵۶ کا " والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا صلہ"]

کی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں انھیں جگہ عطا فرمائے

اور خاص کر اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر عقیدت و محبت کا سلام عرض ہے جن کی شفقت و مروت نے اس لائق بنایا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو والدین کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے کی توفیق عطا فرماکر سعادتِ دارین کی سعادتوں سے مالامال فرمائے — آمین !!

یہ قصّہ لطیف ابھی ناتمام ہے جو کچھ بیان ہوا وہ آغاز باب ہے

محمود و ایاز

شاہ عبدالرحیم قادری کامی

رشتہ سلطان محمود غزنوی اور ایاز (آقا و غلام) ایک شیریں داستان بن کر رہ گیا ہے ۔ کوئی ایک واقعہ کہیں کا فسانہ بن کر رہ جاتا ہے کہیں کوئی فسانہ روایت بن جاتا ہے ۔ اور کبھی ایک داستان جس کو زمانہ در زمانہ دہرایا جاتا ہے ۔ مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، انار کلی، چندر بدن مہیار وغیرہ کئی ایک جہت سے کئی طریقوں سے ایسی داستانوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے ۔ ان کی مثالیں بنا کر نظریاتی راستے نکالے جاتے ہیں ۔ شاعروں، ادیبوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے انھیں استعمال کیا ہے ۔ علم منطق کے لیے اس کی تائید لی گئی ہے، اس پر فلسفہ باندھا گیا ۔ طرح طرح کی مثالوں سے ان کا موازنہ کیا گیا ۔ آج تک حضرات بلال رضی اللہ عنہ کی مثال رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے زندۂ جاوید ہے ۔ اقبالؒ کا مشہور شعر ہے ۔

فلسفہ رہ گیا طرزِ غزالی نہ رہی ! رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

محمود و ایاز کا رشتہ جذباتی تھا، اسی طرح ایک داستان بن کر رہ گیا جو آج تک زندہ ہے ۔ اس کو آقا اور بندہ کا ایک جذباتی رشتہ ہی نہیں بلکہ "عبد و رب" کی نسبت بھی صوفیا نے اس رشتہ کو مثال بنا کر فہمائش کی ہے ۔ اس داستان کو "اللطیف" کے صفحات کو مزین کرنے کے مکرر خیال کے تحت یہ دو چند واقعات قارئین کے پیشِ نظر ہیں ۔

اوّل یہ جان لینا ضروری ہے کہ غلام عام نوکر کی طرح نہیں ہوتا تھا ۔ غلام کو حقیر سمجھنا اور نوکر سے بھی کم درجہ سمجھنا غلط ہوگا ۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غلام کا مرتبہ نوکر سے بلند مقام رکھتا تھا ۔ اور اپنی خاص عزت بھی رکھتا تھا ۔ کسی کو نوکر بنالیا یا رکھ لیا جاتا ہے ۔

اور فوری طور پر برخاست بھی کر دیا جاتا ہے۔ یا خود چلا جاتا ہے۔ اس کو اُجرت پر رکھا جاتا ہے بعض دفعہ نوکر عمر بھر کی خدمت سے وفاداری اور جان نثاری سے کنبہ کا ایک فرد بن جاتا ہے اور بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے۔ پھر بھی غلام کا درجہ نہیں پاتا غلام زر دے کر خریدا جاتا ہے یا جنگوں میں مالِ غنیمت میں قیدی کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ عورت ہو تو لونڈی کہا جاتا تھا۔ یورپ میں، عرب میں، عجم میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کے لیے موسمی بازار منعقد ہوا کرتے تھے۔ کسی رئیس کی حیثیت کو اس کے پاس کے غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا۔ اس طرح غلام دولت میں شمار کیا جاتا تھا۔ غلام کو برخاست نہیں کیا جاتا تھا۔ اور خود کو بھی نوکر کی طرح رُک جانے کا غلام کو اختیار حاصل نہیں تھا۔ غلام ناپسند ہونے پر بیچ دیا جاتا تھا۔ یا خوشی کے موقع پر مثلاً ولادت یا شادی یا نعمت و فیض کے حصول کی خوشی میں غلام کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ بیک وقت کئی غلاموں کو آزاد کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس طریقہ کو منسوخ کرنے لیے اقدام اٹھایا اور غلاموں کو آزادی دلائی گئی۔ غلام کو آزاد کرنا باعثِ ثواب اور آخرت کا اجر قرار دیا گیا۔ دیگر حکومتوں نے بھی اس کو سماجی بہتری اور ارتقاء کی خاطر غلاموں کی رہائی کے لیے اقدامات اٹھائے اور اس طریق کا انسداد کیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ انسان ہی طاقت کے بل پر ہر کمزور انسان کو مجبور کر کے یا مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر بچہ ہو یا جوان، عورت ہو مرد زر خریدہ غلام کی طرح آج بھی غیر قانونی شکل پر چھپے دبے غلام بنا لیتا ہے لیکن غلام کی آج وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو ایک رسمی طریق کے طور پر رہی ہے

بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ غلام اپنی وفاداری اور جان نثاری کی وجہ سے ایسا خاص مرتبہ حاصل کر لیتا تھا کہ آزاد کر بھی دیں تو آقا کی محبت کی وجہ سے آزادی قبول نہیں کرتا اور کنبہ سے لگا رہتا۔ ایسا غلام (باوجود اس لقب سے پکارا جانے کے) آقا کا مقرب و مشیر بھی بن جاتا بلکہ آقا کا ایسا راز دار ہو جاتا جو اولاد کو نصیب نہ ہو۔ اولاد میں بیٹیاں بیاہی جاتیں اور گھر چھوڑ کر چلی جاتیں۔ لڑکوں کو حصہ دے کر الگ کر دیا جاتا، لیکن غلام اپنے آقا کا تنہا مقرب و بدنی محافظ ہی نہیں بلکہ مالی محافظ کا مرتبہ بھی حاصل کر لیتا۔ تجوری کی کنجیاں ہیں تو غلام کے پاس، گودام کا سارا ذمہ تو غلام کے پاس، آقا خاص طور پر مشورہ کرتا ہے تو غلام کے پاس، اولاد کو بھی کچھ دینا ہے تو آقا غلام سے کہتا کہ تجوری کھول کر فلاں مال

زیور یا پیسہ لا دو۔ فلاں صندوق کھول کر فلاں کپڑے لا دو۔ گودام سے فلاں فلاں کو اتنا اتنا اناج دے دو۔ غرض بسا اوقات غلام اولاد سے بھی معتبر درجہ حاصل کر لیتا تھا۔ لیکن اس کا خاص اپنا کچھ حصّہ نہیں ہوتا۔ جو کچھ آقا کا ہوتا تھا وہ گویا غلام کا بھی ہوتا تھا جو آقا کھاتا وہی غلام بھی کھاتا اور جو آقا پہنتا وہی غلام بھی پہنتا۔ اسلام نے غلام کے ساتھ حسنِ سلوک کے آداب کی رُو سے اس کی عزّت بڑھادی۔

ایاز ایک ادنیٰ غلام محمود غزنوی کے پاس کچھ ایسا ہی مقام حاصل کر چکا تھا۔ شاہی خزانے کی کنجیاں، اس کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ بعض معاملات میں وزراء پر ایاز کو سبقت دیے جانے کے واقعات دیکھے گئے۔ خودداری اور مراتب کا تقاضا تھا۔ غلام کے تقرب واقتدار کو دیکھتے دیکھتے وزیروں میں آپس میں کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ بیزاری اور بغاوت کا اظہار ستراً اور علانیہ بھی ہونے لگا اور سلطان کے پاس ایاز کے خلاف شکایتیں بھی شروع کر دیں۔ ایاز سنتا اور خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس کا مقصد محض آقا کی خوشنودی تھی۔ سلطان ساری شکایتیں سنتا رہا اور موقع کی نزاکت کے تحت جس طرح مناسب ہوتا ویسے جواب دے کر ٹال دیتا۔ جس سے وزراء کی بھی دل شکنی نہ ہو۔ آخر وزراء بھی تو حکومت کے ستون تھے۔ حکومت کا دار و مدار اور امن و انتظام کا ذمہ کچھ ان پر بھی تو منحصر تھا۔ مثلاً مال گزاری اور فوج داری کے امور میں وزراء پر ایک غلام کو ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن بسا اوقات ان شکایات کرنے والوں کا منہ بند رکھنے کے لیے انھیں پسپا کرنے کے لیے سلطان نے کئی مصلحتوں سے کام لیا۔ اور کچھ بناوٹی حالات بھی پیدا کرنا ضروری ہو جاتا۔ جس کی وجہ سے حاسدوں کو ندامت کا سامنا ہو جائے۔

ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ سلطان ایاز کو لے کر اپنے وزراء کے ساتھ سلطنتی امور کے تحت معائنہ کے لیے نکلا۔ راستے میں ایک ریگستان جیسے علاقہ کا قصداً رُخ کیا۔ دھوپ سخت تھی۔ گھوڑوں پر سواری جاگزیں ہو رہی تھی۔ سلطان نے موقع پا کر جھٹکے سے اپنا گھوڑا روک لیا۔ سارے وزراء نے بھی تقلید کی۔ اس جھٹکے میں سلطان قصداً منصوبہ قبل کے تحت اپنی کمر سے ایک موتیوں کی تھیلی گرا دی تھیلی کھلی

ہوئی تھی اور موتیاں ریت میں بکھر گئیں۔ گری ہوئی شئے کو زمین سے چن لینا سلطان کے شایانِ شان نہیں۔ سلطان نے تھیلی کو دیکھا، وزراء نے بھی تھیلی کو دیکھا اور پھر سلطان نے مسکرایا اور فرمایا لُوٹ لو۔ پھر دیکھنا کیا تھا سارے وزراء سواری چھوڑ کر موتیوں پر کود پڑے اور چننے لگے۔ اِدھر جھپٹے، اُدھر جھپٹے، اس جھپٹنے میں کئی موتیاں ریت کے اندر دھنس گئیں۔ ایک ایک کرکے ہاتھ چھوڑ کر ریت چھاننے لگے قسمت آزمائی ہونے لگی۔ دیر تک یہ کشمکش جاری رہی اور جب امیدیں ختم ہوئیں تو اپنی اپنی سواری کی طرف ہونے لگے۔ اچانک سلطان کی طرف نظریں گئیں سلطان مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اور ایاز سلطان کے ہم دوش ننگی تلوار لیے حسب معمول سلطان کا بدنی محافظ بن کر سنجیدہ مزاج ثابت قدم کھڑا تھا۔ سلطان مسکرا کر ایاز کی طرف دیکھا اور آہستہ پوچھا: کیوں ایاز! تمہیں موتیوں سے رغبت نہیں؟ ایاز نے نہایت عاجزی سے سر جھکا کر جواب دیا: کوئی چیز میرے لیے میرے آقا پر سبقت نہیں رکھتی۔ جب موتیوں والا آقا اپنا ہے تو مجھے موتیوں کی کیا ہوس؟ وزراء یہ جواب سن کر حیران اور اپنی ہوس پرستی پر نادم ہوگئے۔

یہ تھا ایک ثبوت ایاز کی جان نثاری کا۔

حسد کی آگ نہ بجھنے والی تھی، نہیں بجھی۔ وزراء کسی نہ کسی موقع کی تاک میں رہا کرتے تھے۔

ایک رات ایک پہرہ دار نے اچانک ایاز کو شاہی خزانے کا دروازہ کھول کر اندر جاتے اور اندر سے بند ہوتے دیکھ لیا۔ فوراً سلطان کی خواب گاہ کا جائزہ لیا اور سلطان محوِ خواب تھا، سوچا بھلا اتنی رات گئے سلطان کو سوتا چھوڑ کر شاہی خزانے میں کیا کر رہا ہوگا۔ فوراً ایک ایک کرکے سارے وزراء اور محل کے خواص کو خبر کردی۔ وزراء نے جاکر دیکھا خزانے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر قفل نہیں تھا۔ فوراً سلطان کو جگا کر خبر کردی کہ ایاز ابھی اور اسی وقت شاہی خزانے کے اندر پکڑا جاسکتا ہے۔ سلطان نے بھی استعجاب کا اظہار کیا۔ نہایت سنجیدگی اور بڑا اعتماد انداز سے تلوار سنبھالی اور فوری طور پر وزراء کو لیے خزانے کی طرف چل پڑا۔ جونہی دروازے کو اندر سے بند پایا تو چیخا: ایاز فوراً دروازہ

کھولو جس حال میں بھی ہو۔ خبردار! ایک لمحہ بھی دیر نہ ہونے پائے۔ سلطان کا حکم ختم ہی ہوا تھا کہ دروازہ سارا کشادہ کھل پڑا۔ اور ایاز دروازے پہ کھڑا تھا۔ لیکن یہ وہ ایاز نہیں تھا۔ جو ہر روز دیکھا جاتا تھا۔ ایک سادہ غریب، میلے کچیلے پھٹے پرانے لباس میں قابلِ رحم مجسمۂ نیاز بن کر کھڑا تھا اور دروازے کے پیچھے مصلّٰی بچھا ہوا تھا۔ سلطان نے پوچھا: یہ کیا حال بنا رکھا ہے ایاز؟ یہاں اندر کیا کر رہے ہو؟ ایاز سراپا نیاز آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہاتے ہوئے کہنے لگا: میرے آقا! یہی وہ لباس ہے جس کو پہن کر میں آپ کے پاس آیا تھا۔ آج یہ شاہی خزانے کی کنجیاں میرے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ میں اس پرانی حالت کو بھلا نہیں سکتا۔ بس روز یہاں آتا ہوں اور اپنے اس حال میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے محوِ ذکر ہوتا ہوں۔ سلطان نے کہا: ٹھیک ہے" دروازہ بند کر لو اور اپنا کام کرو۔ اور نکل پڑا۔ سارے وزراء اور خواص ندامت کا منہ لیے ہوئے پیچھے چل پڑے۔ سلطان نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ یہی ان کے لیے کافی گراں گزرا۔

اب ایک نہایت اہم اور حسین واقعہ پڑھیے۔ جس کو صوفیاء نے بڑے ہی حسن و خوبی کے ساتھ "مسئلۂ جبر و قدر" کی نہالش کے لیے رشتۂ عبد و رب سے وابستہ کر کے تمثیلاً استعمال کیا ہے۔

سلطان محمود کا ایک بھرا دربار دربار تھا۔ سلطان محمود بر سرِ اقتدار تھا۔ قریب الختم حکمرانی کا کاروبار تھا۔ سلطان کے ہم دوش کھڑا ایاز جاں نثار تھا۔ یہی اس کی زینت یہی اس کا شعار تھا۔ رؤساء اور وزراء کا گروہ اپنی اپنی جگہ برقرار تھا۔ سلطان کو خاموش دیکھ کر کچھ اضطرار تھا۔ سلطان نے ایاز کو دیکھا، ایاز کو حکم کا انتظار تھا۔ سلطان نے کہا: جاؤ خزانے میں سے میرے سر کے تاجوں میں سے فلاں تاج جس میں سب سے بڑا اور بیش بہا جوہر جڑا ہوا ہے، لے آؤ۔ ایاز یہ گیا وہ گیا اور جھٹ سے لے آیا۔ سلطان نے اپنے سامنے وزراء اور رؤساء کے درمیان میں ایک چوکی پہ اسے رکھوایا۔ اعلان کیا: ہے تم میں کوئی جو اس تاج کو اٹھا کر زمین پہ زور سے پٹخ دے۔ اتنا زور سے کہ اس کا بیش بہا جوہر چور چور ہو جائے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا، یہ کیسا اعلان تھا۔ اس میں مفقود

کیسا امتحان تھا ؟ کہ بیش بہا جواہر اور سب سے زیادہ زینت بخش تاج کا نقصان تھا۔ کس کو جواب دینے کی جسارت تھی، کس کو منظور ایسی حماقت تھی ؟ عدم تعمیلِ حکم کی وجہ سے چہروں پر ندامت تھی۔ یہ سارا منصوبہ سلطان کی فراست تھی، اس نے دیکھا جو وزراء کی یہ حالت تھی۔ تو خطاب کا رُخ بدلا۔ پکارا : ایاز ! ایاز سامنے آیا۔ سلطان نے کہا اس تاج کو اٹھالے۔ ایاز نے اٹھالیا۔ کہا: پٹخ دے۔ ایاز نے پٹخ دیا۔ اس زور سے دے مارا کہ جوہر چُور چُور ہو گیا۔ بیش بہا تاج تاراج ہو گیا۔ سارا دربار لرز گیا۔ ہر ایک اس تاراجی کو گھورنے لگا۔ ایاز کو اور پھر سلطان کو دیکھا۔ ایاز دست بستہ سر خمیدہ کھڑا رہا۔ سلطان کچھ برہم سے لہجہ میں کہا: ہائے ایاز! حیف ہے تجھ پر اور تیری حماقت پر۔ دربار کے اتنے عقلاء میں کسی نے بھی ایسی حماقت پر آمادگی نہ کی، تو بھی کیسا احمق ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے یہ کیسی حماقت کر بیٹھا۔ تاج کو تاراج کر دیا ؟

قارئین ! ذرا رُک جائیں، غور کریں کہ سلطان کے ان کلمات کا کیا جواب دیا جائے ؟ اندازہ لگائیے کہ ایاز کا حق بجانب کیا جواب ہوگا ؟ کیا ایاز یہ کہہ دے کہ "میرے آقا ! آپ کا حکم تھا، میرے سر آنکھوں پہ تھا۔ میں غلام اور تعمیلِ حکم میرا کام"۔ آپ نے صحیح سوچا۔ یہ جواب بالکل حق بجانب ہوگا۔ لیکن نہیں نہیں! یہ تو آقا سے حجت کلامی ہوگی آقا سے حجت سراپا بے ادبی ہوگی۔ سر خمیدہ ہی سہی، دست بستہ ہی سہی۔ ایسا جواب دینا سینہ تان کر جواب دینے کے ہی مصداق ہوگا۔ کوئی فرق نہیں ہوگا۔

ایاز کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا جذبۂ غلامی، شیوۂ بندگی ایک پل بھی اس بے ادبی کے ارتکاب کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سُنو گے ! کیا جواب دیا ایاز نے ؟

آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا، قدموں پہ گر پڑا، آہ بھری اور کہنے لگا: "مجھے معاف کر دو میرے آقا مجھ سے بڑی نادانی، غلطی ہو گئی"۔ اب دربار میں کیا گزرا ہوگا ؟ آپ کے اندازِ خوش طبعی اور حسنِ قیاس پہ چھوڑتے ہوئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس جواب میں ہر غلام کے لیے نصیحت ہے۔ یہ داستان ہر بندے کے لیے اپنے آقا کی نسبت باعثِ عبرت ہے۔ ایاز کا جواب حافظ شیرازی کے اس شعر کی خوب ترجمانی کر رہا ہے : ؎

گرچہ گناہِ ما نہ در اختیارِ ما حافظ تو در طریقِ ادب کوش کہ گناہِ من است

اگرچہ میرا گناہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی لیکن تو ادب کے طریق کو اپنا لے کہ گناہ میرا ہے۔ گناہ کا اعتراف بندگی کا پہلا شیوہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کیا تھا۔ ربنا ظلمنا انفسنا.... الخ ما اصابك من حسنة فمن الله - وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔

(نیکیاں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور برائیاں تیرے نفس کی طرف سے۔)

آقا ہمیشہ آقا رہے گا بندہ ہمیشہ بندہ رہے گا۔ بندہ لاکھ ترقی کرے آقا نہیں بن سکتا۔ آقا کی نسبت بندہ کے لیے افضل ترین مقام بندگی ہی ہے۔ جس میں سکون ہے، اطمینانِ قلبی ہے۔ لذتِ تعمیلِ احکام ہے۔ فقر ہے۔ فخر ہے۔ فخر ہے آقا کا بندہ ہونا۔ بلند ترین مقام ہے بندگی۔ بندگی بندے کی شانِ عظیم ہے۔

گر تو خواہی خرّمی و بندگی — بندگی کن، بندگی کن، بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است
خواجگی را خواجگی از بندگی است — بندگی کردن کمال خواجگی است

اگر تو خوشی اور زندگی چاہتا ہے تو بندگی کر بندگی کر بندگی کر
زندگی کا مقصد بندگی ہے اور زندگی بے بندگی شرمندگی
سرداری کی سرداری بندگی سے ہے۔ بندگی خواجگی کا کمال ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وما خلقت الجن والانس لیعبدون) جب انسان کی پیدائش کا مقصد ہی بندگی ہے تو اس کو اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے مالک کی بندگی اور رضاجوئی میں صرف کرنا چاہیے۔ اس کا بہترین اور مکمل نمونہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے ملتا ہے۔ آپؐ کے ہر فعل سے اقرار بندگی عیاں تھا۔ اور ہر لمحہ اس کی رضاجوئی میں صرف ہوتا تھا۔ رات رات بھر آپؐ اپنے پروردگار کے حضور نماز میں قیام میں گزارتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پائے مبارک متورم ہوجاتے تھے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپؐ کیوں اپنی جان پر اتنی مشقت اٹھاتے ہیں۔ کیا آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہیں فرما دیئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ ہوں۔

جب آپؐ تناولِ طعام کے لیے بیٹھتے تو گھٹنے کھڑا کرکے اکڑوں بیٹھتے تھے اور اس نشست کو

(بقیہ صـ115 پر ملاحظہ ہو)

جوهر ما نفسه ؟

پی۔ پی۔ علی قادری: پرمبلاو۔ کیرالہ: متعلم دار العلوم لطیفیہ ویلور

حمدا لمن انعم علينا بالبيان وصلوة وسلاما على من اتانا بالبرهان واصحابه
الذين هم نجوم العرفان۔

ارسل الله عزوجل سيدنا محمد صلعم الى الدنيا لتزكية العالم فى القرن السادس
نظهر اهمية الرسالة الرسول (صلعم) فى الزمان الذى نحن فيه فيه غظمة للانسانية
فضلا تاثر اهمية رسالة النبى (صلعم) فى القرن السادس الذى هى افنى زمان واقبح عصر
فى مامضى فى العالم وذلك لأن اصحاب قرن السادس كانوا بعدين عن ثقافة
الانسان بعيدا جدا وازكاهم النبى (صلعم) تزكية تامة وجعلهم اصحاب علم
وفكر ولم يمكن هكذا لاحد من قبل وجميع الرؤساء حتى الاعداء اثنى
الرّسول (صلعم) على هذ الافعال المحموزة ورؤساء الدنيا كلهم رأو فى
الرّسول المبعوث فى آخر الزمان الذى ارسل لاصلاح كافة المخلوقين
صلاحية لا نكاد نرى ذلك فى احد غيره۔ حوّل مجيئ النبى (صلعم) وافعاله
حالة العرب من البهيمية الى ثقافة الانسان واما حالة العرب قبل مجيئه
لم تكن فيها ثقافة لاحد سيّما للغرباء لعلّ الانسان يقتل فجئة يوما فيوما حتى لمّا
جاء خلافة عمر (رض) يمر الانسان من جانب الى جانب اخر آمنا ولا احمل ولا عداوة عليه
ذلك تدل على اهميّة بعثة الرسول (صلعم) فى العالم الجديد مساواة الاسلام
بين الناس اي لا فضيلة فى الاسلام للعرب على العجم وللابيض على الاسود
وللاحمر على الاصفر الا بالتقوى ايها الخلان الكرام اسعوا الى التقوى

لقوله تعالى "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" ولذلك جمعنا فى هذه
المدرسة المباركة* لجوهر ما اعظمه وما انفسه لهذا الجوهر فارقنا
الخلان والاخوان والاوطان و تجاوزنا مسافات وسبيعة عميقة
وليس من غرضنا وقصدنا اقتطاف زهرة الدنيا الفانية او تنظيم
العيش فى هذه دار الهالكة ولهذا الجوهر خُلِقَ كلما نرى هنا
اعظم بمنزلة اا صاحبة اكرم لرتبة لِأَهله جوهر لا يوازيه جوهر
من جواهير العالم جوهر لا يعادله شيئ من اللآلى والنفائس
لا يسرقه اللصوص ولا ينتهبه القطاع لا ينقصه الانفاق
لا يحكم عليه بل يحكم به فيه تصنيف المصنفين وتعليم المعلمين
ووعظ الواعظين ولنظر الناظرين وانتباه الغافلين بل لاجله
انزلة الكتب على النبيين خلقت السماوات والاراضين تأملوا
فى قوله تعالى: "اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ
يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ
اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔

وبالجملة حصل المنى ونال كل المنال:
كما افات المرام والمقاصد من افات

مَا نِلْتَ إِنْ لَمْ تَنَلْ عِلْمًا خُلِقْتَ لَهُ
وَإِنْ تَنَلْ غَيْرَهُ مِنْ سَائِرِ النِّعَمِ
مافات منك اذا نلت العلوم وان
فاتت سواها الدنا يا عاليَ الكرم

فعلينا السعى وبذل الجهد لِإشاعة هذا الجوهر الذي
هو القطب وعليه المدار

وفقنا البارى الى ما فيه رِضاه الدعاء اهم المرام وبه الختام

* يعني اللطيفية اجتماعنا ومكثنا فى هذه المدرسة المباركة

نعت شریف

ڈاکٹر حکیم سید افسر باشاہ صاحب افسر ۔ گڈیاتم

صبا کیسی طیبہ سے آئی بھلی ہے
جدھر دیکھو ہر سمت خوشبو رچی ہے
وفورِ تجلّی کی ایسی لگی ہے
جہاں رات دن روشنی روشنی ہے
میری زندگی ساری غم میں ڈھلی ہے
کہوں کیا خدایا عجب بے کلی ہے
جو آئے کبھی مجھ کو تکلیف و آفت
لیا نام آپ کا تو آفت ٹلی ہے
جو عشقِ محمدؐ سے سرشار ہوگا !
وہی مردِ مومن خدا کا ولی ہے
نظر میں رہے ان کا چہرۂ مبارک
میں ہر وقت دیکھوں تمنّا یہی ہے
یہ فضل و کرم ہے کہ اس وقت مجھ کو
جو نعتِ محمدؐ کی دولت ملی ہے
مدینہ کی جانب چلو تم بھی افسر
کہ جنّت سے بڑھ کر نبیؐ کی گلی ہے

میرے آقا کی یادیں بڑھ گئیں جی بھر کے رونے میں
نہیں کوئی مزہ دنیا کی دولت اور دفینے میں
مجھے لے چل خدایا اب ترے کعبے مدینے میں
کمی ہے کون سی یا رب بتا تیرے خزینے میں
مرے ساقی وہ زمزم ہو کہ یا وہ جامِ کوثر ہو
مزا آئے گا مجھ کو آپؐ کے ہاتھوں سے پینے میں
تمنّا ہے مری جاں آنؐ کے قدموں پہ فدا کر دوں
مرے سرکارؐ جب ہوں خوش مزا آئیگا جینے میں
قسم اللہ! چنبیلی، مشک و عنبر میں نہیں خوشبو
عجب خوشبو ہے دیکھو میرے آقاؐ کے پسینے میں
عقیدت جب کہ سچّی ہو مرادیں پوری ہوتی ہیں
کہیں ہم ہوں مگر دل ہو سراسر جب مدینے میں
دلِ بے تاب سنبھل کے چل سکونِ دل میسر ہو
کہ دیدارِ محمدؐ کی تڑپ ہوتی ہے سینے میں
بسا کر ان کی یادوں کو تو دل میں لے حکیم افسر
حریمِ قدس کے صدقے مزا آئے گا جینے میں !

پیش کش : سید عبد القادر (کنڈاپلی) متعلم دار العلوم لطیفیہ ۔ حضرت مکان ویلور

نعت شریف

اُمّت کے دھنی محبوب خدا یہ شانِ رسالت کیا کہنا
یا شافع عرصہ روزِ جزا محنت رشفاعت کیا کہنا

فاران کی چوٹی سے اٹھ کر چھائی ہیں گھٹائیں عالم پر
ایمان کی سوکھی کھیتی کو بخشی ہے تراوت کیا کہنا

والشمس واللیل رُخِ زیبا واللیل ہے وصف زلفِ دوتا
والفجر ہے جس پہ دل سے فدا وہ مہرِ نبوت کیا کہنا

یٰسٓ بھی یہی طٰہٰ بھی یہی مزّمل بھی مدثّر بھی
آیا ہے قسم اللیل ان کے لیے یہ شان عبادت کیا کہنا

اللہ غنی یہ فیض اتم دشمن بھی رہے ممنونِ کرم
اے جان سخاوت صلّ علیٰ اے شرافت کیا کہنا

وحدت کا علم ہاتھوں میں ہے اب جبریل جلو میں مہر بلب
اور انا فتحنا وعدۂ رب اے نازِ شجاعت کیا کہنا

حاضر ہیں یہاں صف باندھے ہوئے اقصیٰ میں سب نبیوں کے پرے
یہ ذوقِ عبادت کیا کہنا یہ شانِ امامت کیا کہنا

سر سجدے میں رکھ کر صبح و مسا "یا ربِّ ھب لی" کی ہے دعا
اے ختم رسلؑ اے رحمتِ کل اُمّت پہ عنایت کیا کہنا

خوش بو ہے ہے نورانی تن کی شرمندہ نکہت گلشن کی!
اس نورِ مجسّم کے شاذی جلوؤں کی لطافت کیا کہنا

خواجہ شاہ وجیہ الدین چشتی قادری
وانم باڑی

پیشکش: محمد شہاب الدین (گنگاوتی) شعبۂ حفظ: دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

نعتِ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

سید سراج الدین منیر حیدرآباد

مظہرِ حسنِ ذات تم، مظہرِ کُل صفات تم
سیّدِ کائنات تم، خواجۂ شش جہات تم

خالقِ کائنات حق، ناظمِ کائنات تم
صورت گرِ حیاتِ رب، سیرت گرِ حیات تم

نورِ زمین و آسماں، ذاتِ خدا ہے بے گماں
عالمِ شش جہات میں مبدائے نورِ ذات تم

کارگہِ حیات میں عالمِ بے ثبات میں
بود و عدم کے صید ہم سلسلۂ حیات تم

تم سے زمین و آسماں، بزمِ مکاں و لامکاں
تم سے بہارِ زندگی، رونقِ کائنات تم

شاہدِ ذاتِ کبریا، سرورِ جملہ انبیاء
فیض رسانِ اولیاءؒ، صاحبِ معجزات تم

کسب و کمال و علم و فن، حسن و جمال و بانکپن
بابِ کرم کے سب گدا، بحرِ نوازشات تم

مہر و مہ و نجوم سب کا سر بکف پئے طلب
در پہ کھڑے بہ صد ادب قاسمِ نورِ ذات تم

کیا مہر و ماہ کیا منیرؔ چشمِ کرم سے مستنیر
صیدِ تعیّنات ہم، بحرِ تجلّیات تم

پیش کش: جمیل احمد شریف (میسور) متعلم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

نورِ یادِ رفتگان

نظم مرثیہ بہ وقت پہلی برسی شیخ المشائخ اعلحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری قدس اللہ سرہٗ العزیز (سجادہ نشین خانقاہِ حضرت قطبؒ ویلور۔

بروز چہارشنبہ۔ مورخہ یکم نومبر ۱۹۹۵ء۔

اثرِ خامہ: علیم صبا نویدی

داستاں در داستاں ہے حضرتِ باقر کی یاد
نورِ جانِ دلبراں ہے حضرتِ باقر کی یاد

پھول پھل مسند نشیں ہیں اور کلیاں تاجور
منظرِ جنت نشاں ہے حضرتِ باقر کی یاد

محفلِ برسی میں خوشبوئے درودِ مصطفےٰ
رونقِ حضرت مکاں ہے حضرتِ باقر کی یاد

کیا مبارک ساعتیں ہیں کیا مبارک شام ہے
چارسو وردِ زباں ہے حضرتِ باقر کی یاد

سینہ سینہ روشنی ہے ذہن و دل ہیں عطر بیز
ہر طرف جلوہ فشاں ہے حضرتِ باقر کی یاد

ہیں ہلالِ عثمان پاشا بزم میں غمگیں بہت
ان کی اشکوں سے رواں ہے حضرتِ باقر کی یاد

دیدہ نم ہے خانقاہِ علم و فن حضرت مکاں
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے حضرتِ باقر کی یاد

نیکیاں ان کی نویدیؔ کیوں نہ سینے سے لگائیں
حاصلِ کون و مکاں ہے حضرتِ باقر کی یاد

پیش کش: مولانا مولوی ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب: ناظم دارالعلوم لطیفیہ۔

اللطیف



مدفنِ اعلیٰ حضرتؒ درمیان حضرت ذوقیؒ اور حضرت قربیؒ

دار العلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور